تعارف تاریخ اردو

جدید ایڈیشن

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
شعبۂ اردو

... ب کہ وہ ان کوتاہیوں
مشاہیر شعراء اردو ... بھی فرمائیں تاکہ آئندہ

"خدا کرے کہ قیامت ہو اور تم آ جاؤں"

ناشر

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

بار اول اپریل ۱۹۶۲ء

جدید ایڈیشن

بار دوم مارچ ۱۹۶۳ء

قیمت

چار روپیہ

طابع

سرفراز قومی پریس

۲۹۱ء ۳

۹۲

ترتیب

حصّۂ اوّل

حصّۂ دوم

ہے کہ وہ ان کوتاہیوں
بھی فرمائیں تاکہ آئند

حصّۂ سوم

۲۴۱ ـــــــ ۳۴۴

اُردو نثر

اُردو نثر کی تاریخ، مشہور و متداول اصناف کا

تعارف۔ مشاہیر ادب

اُردو کے چند ادارے
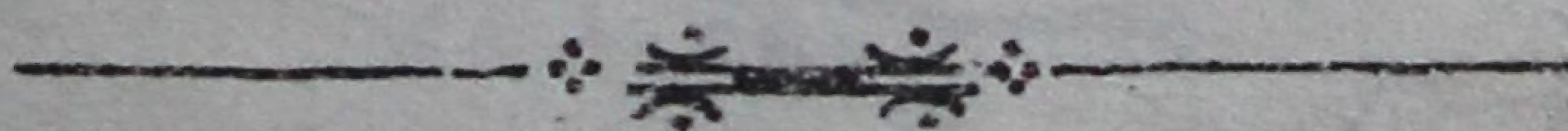
تعارف

کسی زبان کی تاریخ صرف زبان ہی کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے بولنے والوں کی تہذیب و معاشرت، تعلیم و ترقی اور ان کے احساسات و جذبات، خیالات و رجحانات اور گفتار و کردار کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زبان نے ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں کیا اہم حصہ لیا ہے؟

اُردو زبان میں یہ خصوصیت اور صلاحیت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے، وہ ہندستان میں متعدد اور مختلف قوموں کے میل ملاپ کی نشانی ہے۔ اس کو تمام ہندستانیوں نے مل جل کر پروان چڑھایا، اور اس میں اپنے خیالات ادا کئے۔ اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر غیر ملکیوں (یورپین اقوام) نے بھی اس کو گلے لگایا اور اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر اس کی توسیع و ترقی میں خاص دلچسپی لی۔

اُردو کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اُردو جگت بھاشا نہ سہی، دیش بھاشا، ضرور رہی ہے۔ اس نے ہندستانیوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ کر، ایک جان دو قالب بنایا ہے۔ اسی نے "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کا سبق پڑھایا۔ اس خصوصیت میں ہندستان کی کوئی دوسری [illegible] ہے کہ وہ ان کوتاہیوں سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سندھ، پنجاب، کشمیر، دلی بھی فرمائیں تاکہ آئندہ

دوسرا حصہ اُردو نظم کے لئے مخصوص ہے۔ پہلے اُردو نظم اور مشہور اصناف سخن کی تاریخ اور عہد بعہد ترقی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد شاعری کے اسکول اور ہر دور کے مشہور شعراء کے حالات اور کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں نے متوفی شعراء کی ترتیب، ان کے سن وفات سے قائم کی ہے۔ اگرچہ اس اصول پر مکمل پابندی نہیں ہو سکی۔ تاہم یہ کوشش ضرور کی ہے کہ ترتیب اسی اعتبار سے ہو۔ ہر دور کے خاتمہ کے بعد مختصر طور پر اس کا جائزہ بھی لے لیا ہے۔

تیسرا حصہ نثر کے متعلق ہے، پہلے نثر کی تاریخ نہایت اختصار کے ساتھ لکھی ہے۔ اس کے بعد، نثر کی مختلف مروجہ قسموں کا اجمالی تذکرہ کر دیا ہے۔ لسانیات اور انشائیہ پر بھی ان کی اہمیت کے پیش نظر مختصراً روشنی ڈال دی ہے۔

سب سے آخر میں اُردو کی ترویج و اشاعت کرنے والے چند اداروں کا حال مختصر طور پر لکھ دیا ہے۔

اس بات کا مجھے افسوس ہے کہ اختصار کے باوجود کتاب کی ضخامت مجوزہ صفحات سے زیادہ ہو گئی اور بہت سے مشہور شعراء اور ادبا کا ذکر بھی نہ کیا جا سکا، تاہم میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے کہ ہر مکتب خیال کے مشاہیر کا تذکرہ ہو جائے۔

اپنی علمی بے مائیگی اور محدود معلومات کے پیش نظر یہ بعید نہیں ہے کہ کتاب میں خامیاں اور غلطیاں ہوں، ارباب بصیرت سے التماس ہے کہ وہ ان کوتاہیوں سے نہ صرف درگزر فرمائیں، بلکہ زحمت فرما کر مجھے مطلع بھی فرمائیں تاکہ آئندہ

ایڈیشن میں خامی نہ رہے۔
کتاب کی ترتیب و تکمیل کے سلسلہ میں جناب سید ظہیر الدین علوی صاحب رجسٹرار جامعہ اُردو علی گڑھ، محترم ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب صدر شعبہ اُردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی اور محبی مولانا محمد یونس خالدی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جن کے مفید مشورے میرے لئے چراغ راہ بنے۔ عزیزی محمد عتیق سلمہ اور سعادت علی سلمہ شکریہ سے زیادہ دعاؤں کے مستحق ہیں۔ ان دونوں نے بڑوں سے زیادہ میرا ہاتھ بٹایا۔

کتاب کی تیاری میں اُردو کے متعدد مطبوعہ و قلمی تذکروں، شعراء کے دواوین اور ادبی، لسانی، تاریخی و تنقیدی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا وجود حافظ محمد حسین شمس علوی کاکوروی (ناظم ادارۂ فروغ اُردو) کی ادب نوازی اور سید انصار حسین صاحب منیجر سرفراز قومی پریس کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔
اپریل ۱۹۶۲ء

جدید ایڈیشن

الحمد للہ کہ ایک سال کے اندر ہی "تعارف تاریخ اُردو" کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اب جدید ایڈیشن نظر ثانی کے بعد شایع کیا جا رہا ہے، اس ایڈیشن میں کہیں کہیں ترمیم اضافہ کر کے عبارت کو زیادہ آسان کر دیا گیا ہے۔ مشاہیر ادب کے سن پیدائش اور سن وفات کو بڑی تحقیق کے ساتھ درست کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں محبی سید منظور الحسن برکاتی صاحب (ٹونک راجستھان) نے امداد و رہنمائی کی ان کا خلوص شکریہ سے بے نیاز ہے۔

میں شکر گزار ہوں کہ جامعہ اُردو علی گڑھ کے علاوہ یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں نے کتاب کو داخل نصاب فرما کر میری حوصلہ افزائی کی۔

توقع ہے کہ جدید ایڈیشن طلباء اور اُردو تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

(ڈاکٹر) شجاعت علی سندیلوی
شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء

حصّۂ اوّل

آغازِ اُردو

اُردو کی پیدائش، تشکیل، تدریجی ترقی
اور
اُس کے مختلف نام
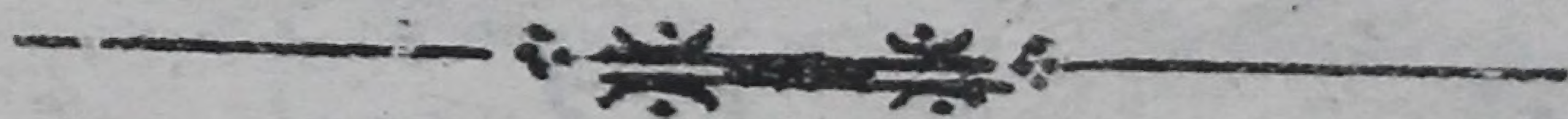
ترتیب

جنوبی ہند دکن

آغاز اُردو

اُردو کی پیدائش ۔ ہر زبان کی ابتدا روزمرہ کے ضروری کاموں کے لئے معمولی الفاظ سے ہوتی ہے جب دو یا اس سے زیادہ زبانیں جاننے والے آپس میں ملتے ہیں تو سب سے پہلے ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولنے لگتے ہیں یہ الفاظ زیادہ تر اسم ہوتے ہیں جیسے جیسے تعلقات اور بات چیت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسمآء کے ساتھ ساتھ افعال بھی استعمال ہونے لگتے ہیں اور کچھ ہی عرصہ میں نئی زبان کے الفاظ و فقرات کی اچھی خاصی تعداد ہو جاتی ہے۔

اُردو زبان کی پیدائش بھی اسی فطری اصول کے تحت ہوئی۔ عرب و ایران، ترکستان و افغانستان وغیرہ سے آرہے ہوئے لوگوں کی زبانوں کے الفاظ ہندستان کی زبانوں میں شامل ہونے لگے مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی یہاں کی زبانوں میں عربی و فارسی کے الفاظ جگہ پانے لگے تھے مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ عمل اور زیادہ موثر طریقے سے ہونے لگا سب سے پہلے سنہ ۶۳۶ء میں مسلمان ہندستان کے ساحل سندھ پر حملہ آور ہوئے لیکن ناکام رہے اس کے بعد سنہ ۶۴۴ء میں عربوں نے مکران اور بلوچستان کو فتح کر لیا اور سنہ ۶۶۴ء میں کابل سے ملتان تک پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا اس کے بعد سنہ ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس کو اپنے قبضہ میں کر لیا سنہ ۷۱۳ء تک اس نے ملتان اور دیگر مقامات بھی فتح کر لیے۔ اس وقت سے سیکڑوں برس تک

مسلمانوں کی حکومت اس علاقہ میں رہی جس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور زبان سے واقف ہوئے اس وقت تک سندھ میں سندھی اور عربی دونوں زبانیں رائج تھیں البتہ ملتان میں ملتانی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی بولی جاتی تھی۔

جب مسلمانوں نے پورے وسط ایشیا پر قبضہ کر لیا اور ایران، افغانستان ترکستان وغیرہ ممالک ان کے قبضہ اقتدار میں آگئے تو انھوں نے شمال مغرب سے ہندستان کی طرف رخ کیا سب سے پہلے ۹۸۶ء میں غزنی کے بادشاہ سبکتگین نے کابل سے پشاور تک پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد محمود غزنوی نے (۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۷ء تک) ہندستان کے مختلف علاقوں پشاور، ملتان، کالنجر، قنوج، متھرا، گجرات وغیرہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا ۱۱۹۳ء تک غزنوی خاندان پنجاب پر قابض رہا اس کا دار السلطنت لاہور تھا اس عرصہ میں عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی، تاتاری وغیرہ مختلف اقوام کے مسلمان آکر پنجاب میں آباد ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی زبانوں میں ہندستانی زبانوں کے الفاظ شامل ہونے لگے اور ہندستانیوں نے عربی فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ بولنا شروع کئے اس طرح ایک مخلوط زبان بننے لگی۔

۱۱۹۳ء میں محمد غوری نے غزنوی خاندان کی حکومت ختم کر کے دلی تک قبضہ کر لیا اور اس نے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت بنا کر ہندستان میں مستقل سلطنت کی بنیاد ڈالی رفتہ رفتہ قطب الدین ایبک نے تمام شمالی ہندستان فتح کر لیا۔ ۱۲۰۳ء تک بہار، بنگال، بندیلکھنڈ اس کے قبضہ میں آگئے۔ محمد غوری کی وفات کے بعد ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے ہندستان میں آزاد حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ اور تیز ہو گیا وہ یہاں

آ آ کے آباد ہونے لگے، یوں تو قریب قریب وہ پورے شمالی مغربی علاقہ میں آباد ہوگئے۔ لیکن دلّی اور اس کے نواح میں انھوں نے تازہ بستیاں آباد کیں اور اسی علاقہ کی زبان سے وہ زیادہ متاثر ہوئے۔ نئی زبان کے ذخیرے میں الفاظ کا خزانہ بڑھنے لگا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ چھوٹے چھوٹے فقروں کی شکل اختیار کرنے لگے۔

اُردو کی تشکیل۔ علاقہ کے اعتبار سے مسلمانوں کے مرکز سندھ، پنجاب اور دہلی رہے انھیں علاقوں کی زبانوں میں مسلمانوں کی زبانوں کے الفاظ ملے جو زیادہ تر عربی، فارسی اور ترکی تھے یہی مخلوط الفاظ اُردو زبان کے پیدا ہونے کا سبب بنے۔

اس علاقہ کی تمام بولیوں کو مغربی ہندی کا نام دیا گیا ہے۔ مغربی ہندی کا تعلق براہ راست "شورسینی اپ بھرنش" سے ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے شمالی ہندستان کی سب سے زیادہ مقبول اور ممتاز زبان تھی۔ جب مسلمان دہلی میں آئے اور یہیں آباد ہوگئے تو "شورسینی اپ بھرنش" صوتی اور صرفی اختلافات کی بنا پر پانچ بولیوں میں تقسیم ہوگئی۔ صوتی اعتبار سے اس کے اندر دو رجحان نمایاں ہیں۔

(ﻟ) وہ بولیاں جن میں اسمار و اسمار صفات اور افعال کا اختتام (ا) پر ہوتا ہے۔ یہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) کھڑی بولی یا ہندستانی جس پر موجودہ اُردو اور ہندی کا انحصار ہے۔
(۲) ہریانی یا بانگڑو یا جاٹو۔

(ب) وہ بولیاں جن میں اسمار، اسمار صفات اور افعال کا اختتام عام طور پر (او) پر ہوتا ہے۔ یہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) برج بھاشا (۲) قنوجی (۳) بندیلی یا بندیلکھنڈی۔

اس طرح مغربی ہندی اُردو کی ماں ہوئی اور ہریانی، برج بھاشا، قنوجی،

بند ھیلکھنڈی اس کی بہنیں ہوئیں۔
لیکن اُردو کا تعلق حسب ذیل دو اور مخلوط بولیوں سے بھی ہے۔

شمال مغرب میں ــ پنجابی اور ملتانی سے
مشرق میں ــ مشرقی ہندی اور اودھی وغیرہ سے۔

اسی لئے اُردو میں پنجابی، ملتانی اور اودھی وغیرہ کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو کی پیدائش شمالی ہند میں ہوئی، دہلی کے علاقہ میں وہ پروان چڑھی اور آخر کار اس قابل ہو گئی کہ کاروباری معاملات میں عام طور پر استعمال کی جائے عوام اس مخلوط اور نئی زبان کو اپنانے لگے اور فارسی نیز پراکرت پر اس کو ترجیح دینے لگے۔ دہلی کی سلطنت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس نئی زبان کا علاقہ بھی بڑھتا گیا۔

قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش (۱۲۱۱-۱۲۳۶ء) دلی کے تخت پر بیٹھا اس نے بنگال رنتھمبور، گوالیار اور مالوہ وغیرہ فتح کر کے پورے شمالی ہندستان پر قبضہ کر لیا یہ نئی زبان بھی مسلمانوں کے ساتھ ان علاقوں میں پہنچی۔ جنوبی ہندستان میں ابھی تک مسلمان نہیں پہنچے تھے لیکن علاء الدین خلجی نے (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) اس علاقہ کو بھی فتح کر لیا۔ اب پورے ہندستان پر دلی سلطنت کا قبضہ ہو گیا۔ یہ نئی زبان بھی ملک کے کونے کونے میں پہنچ گئی۔

۱۲۹۷ء میں علاء الدین نے گجرات پر قبضہ کر لیا۔ ۱۳۹۱ء تک یہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا لیکن ظفر خاں حاکم گجرات نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور تقریباً دو سو برس تک (۱۵۷۲ء تک) اس کا خاندان حکومت کرتا رہا۔ اس عرصہ میں گجرات میں اُردو کو پھولنے پھلنے کا خوب موقع ملا اور وہاں وہ ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔

علاء الدین خلجی کے سردار ملک کافور نے سنہ ۱۳۰۶ء سے سنہ ۱۳۱۰ء تک جنوبی ہندستان پر قبضہ کر کے وہاں باقاعدہ حکومت قائم کی، دکن میں اردو کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی اس کے بعد جب محمد تغلق نے (سنہ ۱۳۲۵ء یا سنہ ۱۳۲۷ء) دلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا دار السلطنت بنایا اور دلی اور نواح دلی کے باشندوں کو وہاں رہنے کا حکم دیا تو اردو جاننے والوں کی کافی تعداد اس علاقہ میں آباد ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان بہت جلد دکن میں مقبول ہونا شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ پورے جنوبی ہندستان میں پھیل گئی۔

اردو کی پیدائش اس کی توسیع و اشاعت کے اس تاریخی پس منظر میں یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ اردو نے حسب ذیل ارتقائی منزلیں طے کیں۔

۱۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندستانی زبانوں میں فارسی عربی کے الفاظ شامل ہونے لگے تھے۔

۲۔ سنہ ۷۱۲ء تا سنہ ۱۰۰۰ء تقریباً ساڑھے تین سو برس تک سندھ اور ملتان وغیرہ پر مسلمانوں کا قبضہ رہا اس عرصہ میں غیر ملکی اور ملکی زبانوں کا لین دین اتنا زیادہ ہو گیا کہ ایک مخلوط بولی وجود میں آنے لگی۔

۳۔ سنہ ۹۸۷ء سے سنہ ۱۱۹۳ء تک مسلمانوں کا پنجاب پر قبضہ رہا۔ اس عرصہ میں عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی، تاتاری وغیرہ یہاں آباد ہو گئے اور مخلوط بولی کو مزید تقویت پہنچی اور نئے نئے الفاظ بننے لگے۔

۴۔ سنہ ۱۱۹۳ء کے بعد سے دلی کو مرکزیت حاصل ہو گئی اور مسلمان پورے شمالی ہند پر قابض ہو گئے۔ دلی اور نواح دلی میں مسلمان زیادہ آباد ہوئے اور اسی علاقہ کی زبانوں سے زیادہ متاثر و مستفیض ہوئے۔ اب الفاظ ٹوٹے پھوٹے فقروں کی شکل اختیار کرنے لگے۔

۵۔ سنہ ۱۲۹۷ء کے بعد یہ نئی زبان دکن تک پہنچی اور سنہ ۱۳۵۰ء تک پورے جنوبی ہندستان پر چھا گئی۔

ابتدائی اُردو کے نمونے

۱۔ شمالی ہندستان

نئی زبان کی ترویج و اشاعت میں فارسی اور ہندی کے شعراء نے اہم حصہ لیا۔ فارسی شعراء ہندی کے الفاظ اور ہندی کے شعراء عربی و فارسی کے الفاظ اپنے اپنے کلام میں استعمال کرنے لگے گیارھویں صدی عیسوی سے ہی فارسی شعراء کے کلام میں ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں۔

ایران کا مشہور شاعر منوچہری کہتا ہے ؎

الا تا مومناں دارند روزہ الا تا ہندواں گیرند لنگھن

مشہور صوفی شاعر حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

نہ دراں معدہ جز حسد زندہ نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی

ان شعراء کے کلام میں ہندی کے الفاظ کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندستان سے باہر ایران، افغانستان، وغیرہ میں بھی ہندی کے الفاظ مانوس ہو چکے تھے اور وہاں کے شعراء ان کو استعمال کرنے لگے تھے۔

اسی طرح ہندی کے شاعروں نے عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیئے تھے پرتھوی راج کے درباری شاعر چندر بردائی चन्द बरदाई کی مشہور نظم پرتھی راج راسو (سنہ ۱۱۹۱ء) میں عربی فارسی کے بکثرت الفاظ پائے جاتے ہیں۔

سلطان، بادشاہ، سلام، حضرت، پروردگار، پیغام، فرمان وغیرہ لیکن ان الفاظ کا تلفظ ہندوی ہے یعنی پیغام کا پیگام، فرمان کا پھرمان، حضرت کا حجرت وغیرہ۔

شعراء کے علاوہ اس نئی زبان کی سرپرستی بزرگان دین اور صوفیائے کرام نے کی چونکہ ان کا فیض خدا کے تمام بندوں کے لئے عام تھا۔ اس لئے ان بزرگوں کی زبان مبارک سے اکثر ہندی کے الفاظ ادا ہوتے تھے۔

حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ (۱۰۷۲ء) خواجہ معین الدین چشتیؒ (۱۱۴۲ - ۱۲۳۵ء) خواجہ بختیار الدین کاکیؒ (۱۱۸۶ - ۱۲۳۳ء) حضرت بابا فرید گنج شکرؒ (۱۱۹۶ - ۱۲۶۵ء) حضرت مخدوم علی الدین احمد صابرؒ (متوفی سنہ ۱۲۶۵ء) حضرت شاہ بو علی قلندرؒ (متوفی سنہ ۱۳۲۴ء) حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ (۱۲۳۶ - ۱۳۲۵ء) حضرت امیر خسروؒ (متوفی ۱۳۲۵ء)، حضرت شیخ سراج الدینؒ (متوفی سنہ ۱۳۵۷ء) وغیرہ جیسے خدا رسیدہ بزرگوں کی زبان فیض ترجمان نے اردو کے الفاظ اور فقرے استعمال کرکے اس کو برکت و سعادت عطا کی، ان بزرگوں کے اقوال و اشعار ملک بھر میں مشہور ہوگئے جن میں سے چند یہ ہیں۔

بابا فرید گنج شکرؒ نے ایک موقع پر فرمایا ـــ "پونوں کا چاند بھی بالا ہے"

ایک مرتبہ جسم میں عقل کے مقام کی نسبت فرمایا ـــ "بیچ سر کے"

ایک پرانی بیاض میں بابا صاحب کی ایک نظم ملی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

عشق پیا رہو نہ نیارا ہے ۔۔۔ جز مدد پیر کے نہ چارہ ہے

آپ کی ایک غزل بھی ملی ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے ۔۔۔ خیز دراں وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا ۔۔۔ خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

باتن تنہا چہ روی در زمیں ۔۔۔ نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

شکر گنج بدل جاں شنو ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے بہت سے منتر تعویذ بیماری کو دور کرنے کے لئے مشہور ہیں جن کو پڑھ کر پھونکنے سے زہر اور بیماری سے شفا ہو جاتی ہے۔

کالا ہنسا نرملے بسے سمندر تیر پنکھ پسارے بس ہرے نرمل کرے سریر

آپ کا یہ دوہا بھی مشہور ہے۔

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

حضرت امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ کی اختراع پسند طبیعت نے پہیلیوں، کہہ مکرنیوں دو سخنوں میں اُردو کے الفاظ اس طرح استعمال کئے کہ ان میں موزونیت اور شعریت پیدا ہو گئی۔ آپ کا کلام ایجادات و اختراعات کا مخزن ہے۔ خالق باری نظم میں اُردو کی پہلی نعت ہے جس میں ہندی، عربی فارسی کے مرادف الفاظ نظم کئے ہیں۔ سب سے پہلے آپ ہی نے فارسی اشعار اور شاعری میں ہندی بھاشا کی آمیزش سے اُردو زبان و ادب کا آغاز کیا ہے۔ آپ نے فارسی ہندی آمیزش سے ایک غزل بھی لکھی ہے جس کا ایک فقرہ فارسی اور دوسرا ہندی ہے۔

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سنادے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

پہیلی :—

بالا تھا جب سب کو بھایا — بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اُس کا ناؤں — بوجھ نہیں تو چھوڑو گاؤں

ایسے اشعار جن کا پہلا مصرع فارسی اور دوسرا ہندی ہے۔

زرگر پسرے چوں ماہ پارا — کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

خالق باری نہایت مشہور نظم ہے جو اُردو کی منظوم لغت ہے۔

خالق باری سرجن ہار — واحد ایک بدا کرتار

حضرت امیر خسرو کے بعد اُردو میں سب سے پہلی نثر کی کتاب مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی کی کہی جاتی ہے جو اخلاق و تصوف پر ۱۳۰۸ء میں لکھی گئی جس کا نمونہ یہ ہے :—

"اے طالب آسمان و زمین سب خدا میں ہے ہوا سب کیا خدا ہے جو حقیق بیان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر سبھی سب ذات ہی ذات ہے"

شمالی ہندوستان کے بعد گجرات میں اُردو کا چلن عام ہوا جو بزرگوں کا مرہون منت ہے۔

۱۴۵۱ء میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے قطب عالم کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو آپ نے فرمایا :—

"لوہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے"

---

۱۵ داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری۔ اس کتاب کا وجود مشکوک ہے (ش)

اسی طرح شیخ وجیہ الدین گجراتی کے چند مقولے مشہور ہیں۔

عارف اسے کہویا جو خدا سوں بھریا ہو وے ؛ یا

اس سیں ہور کیا خوب ہے   اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہو رہے

۱۵۱۸ء میں شیخ دہلوی نے موید الفضلاء کے نام سے فارسی لغت لکھی جس میں تقریباً آٹھ سو اُردو الفاظ شامل ہیں۔

کبیر داس (۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء) کے دوہے زبان زد خاص و عام ہیں جن میں عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں ؎

کبیر شریر سرائے ہے کیوں سووے سکھ چین   کوچ نقارا سانس کا باجت ہے دن رین

اونچے اونچے محل بنائے گہری نیو میں دھرتا   چلنے کا منصوبہ ناہیں رہنے کو من کرتا

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لئے چنائے   تا چڑھ ملا بانگ دے کیا بہرا ہوئے خدائے

کبیر کی حسب ذیل غزل آسان ہندی اُردو میں ہے:-

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا   رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا

جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے   ہمارا یار ہی ہم میں ہمن کو انتظاری کیا

خلق سب نام اپنے کو بہت کر سر پٹکتا ہے   ہمن گرو نام سچا ہے ہمن دنیا سے یاری کیا

نہ پل بچھڑیں پیا ہم سے نہ ہم بچھڑیں پیا سے ہم   انھیں سے نیہ لاگی ہے ہمن کو بیقراری کیا

کبیرا عشق کا ماتا دوئی کو دور کر دل سے

جو چلنا راہ نازک ہے ہمن کو بوجھ بھاری کیا[1]

---

[1] ("A History of Persian Language and Literature at the Mughal Court")

BABAR — AKBAR

گرو نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۸ء) کبیر کے ہمعصر تھے ان کے کلام میں بھی عربی و فارسی کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

سانس سانس سب جیو تمہارا تو ہے اکھرا پیارا
نانک شاعر یو کہت ہے سچے پروردگارا

تلسی داس (۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۴ء) کے دوہوں اور ان کی مشہور کتاب رامائن میں بھی عربی و فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہات تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات
جو مینا میں نا کہے میٹھی شکر کھائے جو بکری میں میں کہے سہج ہی ماری جائے
تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر فرزیں شاہ نہ ہو سکے گت ٹیڑھی تاثیر

سور داس اور میرا بائی کے کلام میں بھی عربی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں۔

سور داس کہتے ہیں ؎

کھیت بہت کل ہے تم تا میں سین سی آواج دیو نہ جات پار اُتر آوے چلہے چڑھیں جہاج
آواز جہاز

میرا بائی کہتی ہیں ؎

اونچا نیچا محل پیا کا مہا سوں چلیو نہ جائے

ان صوفی شعراء اور بزرگان دین کے علاوہ بادشاہ اور ارکین سلطنت بھی کبھی کبھی اُردو بولتے تھے ۱۵۲۶ء میں جب بابر کے سامنے سلطان ابراہیم لودی کا سرکاٹ کر پیش کیا گیا تو حاضرین میں سے کسی نے فی البدیہہ یہ کہا۔

نوسے اوپر تھا بتیسا پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھیس رجب سکروارا بابر جیتا ابراہیم ہارا

بابر نے خود اپنی تصنیف تزک بابری میں بکثرت اُردو الفاظ استعمال کئے ہیں ہاتھی، پان، پنکھا، گھڑی، دوپہر، وغیرہ اس کے ایک ترکی شعر میں بھی اردو کا استعمال ہے۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک وموتی فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدور پانی وروٹی

گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ کو اس کے سپہ سالار رومی خاں کی غداری اور بیوفائی سے شکست ہوگئی۔ فتح کے بعد ہمایوں کے دربار میں بہادر شاہ کا ایک طوطا بھی آیا جس نے رومی خاں کو دیکھ کر فوراً کہا۔

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام پھٹ پاپی نمک حرام"

اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی جب اکبر اور جہانگیر دلہن کی پالکی اپنے کاندھے پر اٹھا کر چلے تو راجہ نے کہا۔

ہماری بیٹی تمھارے محلوں کی چیری ہم ہاند گلام رہے

اکبر نے برجستہ جواب دیا۔

تمھاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رہے

اسی زمانے میں نوری اعظم پوری ۱۵۶۵ء میں گزرا ہے جس کا ایک شعر مشہور ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد بیچارہ نوری نہ کیے ہے نہ ڈرے ہے

اکبر کے ہی زمانے میں ہندی کے مشہور شاعر گنگ نے ۱۵۷۲ء میں "چند چھند برنن کی مہما" لکھی جو کھڑی بولی میں ہے اور جس میں فارسی، عربی، سنسکرت کے الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے مثلاً

"اکبر شاہ جی عام کھاس (خاص) میں تخت (تخت) اوپر راجمان ہو رہے ہیں اور عام کھاس بھرنے لگا ہے جس میں تمام امرا آ آ کر کورنش بجائے جا کر کے

اپنی اپنی بیٹھک پہ بیٹھ جا کرب اپنا اپنی مسل سے جن کی بیٹھک نہیں سو ریسم (ریشم) کے رستے ہیں ریسم کی لوہیں پکڑے پکڑے کھڑے تا جیم (تعظیم) میں ہے"۔

اکبر کے ہی زمانے میں حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کا کوروی گذرے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک شعر مشہور رہے سہ

ہم تمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

پنڈت چند ربھان برہمن (متوفی ۱۰۷۳ھ) شاہجہاں کے دربار میں منشی تھے ان کی غزل کا ایک مطلع یہ ہے سہ

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے

معز الدین موسوی خاں فطرت ایران کے رہنے والے تھے عالمگیر کے دربار میں معزز عہدہ پر مامور تھے فارسی کے شاعر تھے کبھی کبھی اُردو میں بھی شعر کہتے تھے ایک شعر ان سے یادگار ہے سہ

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی[۱] ہے در گلشن آئینہ گھٹا[۲] جوم[۳] پڑی[۴] ہے

ان مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شمالی ہندستان میں اُردو بول چال کی حد سے گزر کر زبان کی سرحد میں داخل ہو گئی تھی اور عالمگیر کے زمانہ میں اُردو شاعری کا رواج ہونے لگا تھا۔

---

[۱] پڑی۔ [۲] گھٹا۔ [۳] جھوم۔ [۴] پڑی۔

(ب) جنوبی ہند (دکن)

شمالی ہندستان کے برخلاف دکن میں اُردو کا چلن بہت کم عرصہ میں ہوا۔ محمد شاہ تغلق کے سردار حسن بہمنی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے دفتری زبان فارسی کے بجائے ہندی کر دی جس کی وجہ سے اُردو کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں ہو گئیں جنھوں نے اس زبان کی سرپرستی کی بیجا پور اور گولکنڈہ کے سلاطین علم و فن کے بڑے قدر دان تھے۔ ان کی شاہانہ سرپرستیوں کی وجہ سے دکن میں بڑے بڑے باکمال شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جن کی کوششیں اُردو کی ترقی اور بقا کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں یہاں چند مخصوص ابتدائی ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے اُردو کو بولی کے دائرہ سے نکال کر زبان و ادب کی سرحد میں داخل کیا۔

اُردو کتابوں کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں سب سے پہلے شیخ گنج العلم (متوفی ۱۳۰۹ء) کا نام لیا جاتا ہے۔ جو دلّی سے دولت آباد آئے تھے اور بیجا پور میں مقیم ہو گئے تھے۔ دکنی اُردو میں ان کے چند مختصر مذہبی رسالوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ رسائل اب تک نایاب ہیں لیکن اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ دکن میں نثر اُردو کی سب سے پہلی کتاب خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے۔ آپ بھی دہلی سے حسن آباد (گلبرگہ) ۱۴۱۳ء میں آئے اور یہیں ۱۴۲۲ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ عربی اور فارسی کے اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے معراج العاشقین کے علاوہ آپ نے اور رسائل بھی لکھے ہیں۔ آپ کے مقولے اور اشعار بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ جن سے آپ کی قادر الکلامی کا

اندازہ ہوتا ہے۔

ادعشق ۔۔ مثال نور نبی پایا — اور نور نبی رسول کا میرے جیو میں بھایا

معراج العاشقین شائع ہو چکی ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے۔

"اے عزیزا اللہ بندہ تیا یہاں پہچان کو جاتا میں تو شرع جاتا ہے
اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا۔"

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بعد شمس العشاق، شاہ میران جی (متوفی ۱۴۹۶ء) نے شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس لکھیں ان کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) نے کلمۃ الحقائق، رمز الواصلین بشارت الذکر، نثر میں۔ وصیت الہادی اور ارشاد نامہ نظم میں لکھیں جن میں تصوف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم کے فرزند رشید شاہ امین الدین علی (متوفی ۱۶۷۵ء) نے گنج مخفی ۱۶۱۰ء میں لکھی۔ اسی زمانہ میں شاہ میران صاحب خدا نما نے شرح تمہید ہمدانی ۱۶۰۳ء میں۔ مولانا عبد اللہ نے احکام الصلوٰۃ ۱۶۲۲ء میں لکھی ان بزرگوں کی تصانیف سے نثر کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے ان کے بعد ملا وجہی نے سب رس ۱۶۳۵ء میں لکھی جو دکنی اردو میں ادبی حیثیت رکھتی ہے۔

نثر کے ساتھ ساتھ اردو نظم بھی پروان چڑھتی رہی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہ خود بھی سخن سنج اور سخن فہم تھے ان کے دور حکومت میں شعراء و ادباء کی کافی تعداد پیدا ہو گئی۔ شعراء میں سرفہرست سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) ہے۔ سلطان اردو میں معانی اور فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا۔ سلطان کا پورا کلام کلیات کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ سلطان کے کلام میں مقامی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہندستانی روایات بکثرت

ملتی ہیں۔ پچاس ہزار سے زائد اشعار کلیات میں ہیں جن میں مرثیہ بھی شامل ہے
رنگ سخن یہ ہے :۔

کرتے ہیں دعوی شعر کا سب اپنی طبع سوں — بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا
پیاسا ہوں حضرت کے ہست آب کوثر — تو شاہاں اوپر مجھ کلس کر بنایا
خورشید کے اوپر سے ابرو ہلال عید — اس ابروں کو سجدہ کیا ہے وہ ہلال عید

قطب شاہی سلسلہ میں سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء سے ۱۶۲۵ء) اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے جانشین تھے۔ فارسی میں ظل اللہ اور اردو میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے کلام میں شیرینی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ یہ شعر یادگار ہے۔

سنو لوگ مری پریم کی کہانی — کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء - ۱۶۷۲ء) کا تخلص عبداللہ تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے :۔

دلا حق کی طرف ہو کہ حق آرام — سعادت کی تری بات سر انجام لگا

اسی زمانہ میں مولانا وجیہ الدین وجدی نے فرید الدین عطار کے خسرو نامہ کا اردو ترجمہ تحفۂ عاشقاں کے نام سے [illegible] میں لکھا اس کا نمونہ یہ ہے :۔

کروں پاک دل ہو زباں پاک سوں — ثنا پاک اس عاشق پاک کوں
پڑا عکس اس نور کا جس رخن — جھلکنے لگا آرسی کے لگن
سو اس آرسی میں کیا جیوں نظر — ہوا عاشق اپنا اپس دیکھ کر

غواصی، سلطان محمد قطب شاہ کے وقت میں ممتاز شاعر تھے۔ انہوں نے سیف الملوک اور طوطی نامہ دو مثنویاں لکھی ہیں۔ کلام کا رنگ یہ ہے۔

الٰہی جگت کا الٰہی سوتوں — کرن ہار جم بادشاہی سوتوں

ابن نشاطی عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے مشہور شاعر تھے انھوں نے ایک عاشقانہ مثنوی پھول بن لکھی جس کا سن تالیف ۱۶۶۵ء ہے۔

اول میں حمد رب العالمیں کا — دل وجاں سوں کہوں جان آفریں کا

خداوندا تجھے ہے جم خدائی — ہمیشہ تج کوں ساجی کبریائی

ملا قطبی۔ آپ نے ۱۶۳۲ء میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا۔

بولوں صفت میں بے گنت — اس خالق جن و بشر

نردھار کر آسمان رکھیا — سورج ستارے ہور چندر

بحری۔ قاضی محمود بحری صاحب حال صوفی بزرگ تھے زیادہ تر مذہبی اور صوفیانہ مضامین نظم کرتے تھے۔ ان کی تین کتابیں یادگار ہیں۔

(۱) مثنوی من لگن۔ چار ہزار کے قریب اشعار ہیں ۱۷۰۰ء میں تکمیل کو پہنچی۔

(۲) دیوان۔ ایک سو گیارہ غزلیں حروف تہجی کی ترتیب سے ہیں۔

(۳) بنگاب نامہ۔ اس مثنوی میں بارہ جام یعنی بند ہیں اور ہر بند میں متعدد اشعار ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اے روپ ترا رتی رتی ہے — پربت پربت رتی رتی ہے

ہے ناؤ احد نشان احمد — سرخی سو احد ہے پان احمد

عالمگیر اورنگ زیب کی تعریف میں کہا ہے۔

دیندار و دلبر ہور داتا — یک علم نہ سب منے سیانا

نصرتی — علی عادل شاہ کے دربار میں ملک الشعراء تھے ۱۰۸۵ھ میں یہ موجود تھے ان کی تین تصانیف موجود ہیں گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری۔ انھوں نے

مثنویاں اور قصائد بھی لکھے انسانی جذبات اور خیالات کی ترجمانی بڑی خوبی سے
کی ہے ان کے کلام میں رنگینی اور تشبیہ و استعارے کی ندرت پائی جاتی ہے۔

ہاشمی — سید میران نام تھا ۱۶۸۸ء یا ۱۶۹۷ء میں انتقال کیا، انھوں نے غزل،
مثنوی اور مرثیہ سب پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مثنوی یوسف و زلیخا بہت مشہور
ہے جو ۱۶۸۷ء میں لکھی گئی تھی۔

اسی زمانہ میں سیوا اور رام راؤ بھی گزرے ہیں۔ سیوا نے ۱۶۸۰ء میں روضۃ الشہدا
کا اردو میں ترجمہ کیا۔ سیوا اور رام راؤ دونوں مرثیہ گو بھی تھے۔

تانا شاہ کے عہد میں فائز نے اردو میں، ایک مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا"
لکھی اس مثنوی میں ہندی کے بجائے فارسی الفاظ اور ترکیبیں کافی تعداد میں ہیں۔

دکن میں تین سو سال کا یہ جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہ سرزمین اردو
کی نشو و نما کے لیے شمالی ہند کے مقابلے میں زیادہ زرخیز نکلی۔ شمالی ہند میں اردو کو
جو حیثیت پانچ چھ سو برس میں حاصل نہیں ہو سکی۔ جنوبی ہند میں اس سے کم عرصہ میں
اس سے کہیں زیادہ اہمیت و حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ صحیح ہے کہ نثر و نظم دونوں میں ادبیت
شمالی ہند ہی کو ہے لیکن تصنیف و تالیف کا کام باقاعدگی کے ساتھ جنوبی ہندستان
ہی میں شروع ہوا۔ نثر میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ نظم میں بھی غزل، مثنوی، مرثیہ کا رواج
عام ہوا۔ قصیدہ کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ غرض سترھویں صدی کے ختم ہوتے
ہوتے دکن میں اردو ادبی حیثیت اختیار کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔

(ج) اُردو کے مختلف نام

۱۔ اندوستان ۔ قدیم انگریز مورخین نے ہندستان کے حالات لکھنے کے سلسلہ میں اُردو کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کیا ہے ۔

۲۔ مورز بعض انگریز موزخوں نے اُردو کو "مورز" کے نام سے یاد کیا ہے ۔

۳۔ لینگوا اندوستانی اٹھارویں صدی عیسوی کے ابتدائی لاطینی مصنفین نے اُردو کو "لینگوا اندوستانی" کا نام دیا ہے ۔

۴۔ ہندستانی ۔ (ا) ۱۷۷۸ء میں مسٹر پول نے اُردو کو ہندستانی لکھا ہے ۔

(ب) ۱۷۸۷ء میں جان گلگرائسٹ نے اُردو کے لئے ہندستانی کا لفظ استعمال کیا ہے ۔

(ج) انسائیکلو پیڈیا برٹنیکا میں بھی اُردو کا نام ہندستانی تحریر کیا گیا ہے ۔

(د) ڈنکن فابس نے اپنی اُردو قواعد کا نام ہندستانی گرامر رکھا ۔ اسی کتاب میں صفحہ ۸۴ پر حاشیہ میں تحریر ہے "ہندستانی یا اُردو یا ریختہ "

۵۔ ہندی ۔ صوفیائے کرام اور علماء نے اُردو کا نام ہندی لکھا ہے ۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآن پاک کا ترجمہ ہندی کے نام سے کیا ۔ میر کے زمانے تک اُردو کے لئے ہندی کا لفظ استعمال ہوتا تھا ۔

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب
آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زباں کے بیچ

۶۔ ریختہ۔ متقدمین سے لے کر غالب کے زمانے تک اردو کے لئے ریختہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ سعدی کاکوروی جو ولی سے پہلے کے شاعر ہیں کہتے ہیں ؎

سعدی کہ گفتار ریختہ در ریختہ   شیر و شکر ہم شعر ہے ہم گیت ہے

میر کہتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے   معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

غالب کہتے ہیں ؎

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب   سُنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۷۔ اُردوئے معلّیٰ۔ شہنشاہ شاہجہاں نے جب شاہ جہاں آباد، آباد کیا اور لال قلعہ، جامع مسجد، شہر پناہ وغیرہ عمارتیں تعمیر کرائیں تو بازار کا نام اُردوئے معلّیٰ رکھا۔ اردو کے لغوی معنی ہیں امراء وسلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ چونکہ مخلوط زبان شاہی کیمپ میں بولی جاتی تھی اس لئے اس کا نام بھی اُردوئے معلّیٰ پڑ گیا۔

۸۔ اُردو۔ انیسویں صدی ہی میں ریختہ اور اُردوئے معلّیٰ کے بجائے اُردو کا لفظ عام طور پر استعمال ہونے لگا، اگرچہ امپیریل گزیٹر آف انڈیا مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں اس زبان کے لئے صرف اُردو کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے قبل مصحفی نے اُردو کا لفظ استعمال کیا ہے۔

خدا رکھے زباں ہم نے سُنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس مُنہ سے ہم اے مصحفیؔ "اُردو" ہماری ہے

حصہ دوم

اردو نظم

ترتیب

مضامین کے دائرہ سے نکالا گیا ناسخ اور وزیر کی سی مضمون آفرینی جدت پسندی غالب اور مومن کی سی نزاکت اور باریکی خیال، ذوق کی لطافت زبان کسی قدر کم ہوگئی۔ جدید طرز کی غزلیں کہی جانے لگیں۔ داغ، حالی، انور، ظہیر دہلی میں، امیر جلال، تسلیم لکھنؤ میں مشہور ہوئے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے غزل مسلسل انقلاب کا شکار رہی قدیم طرز کی غزل گوئی باوجود مخالفت کے جاری رہی۔ جدید رنگ کی غزلیں بکثرت لکھی گئیں مغربی تعلیم کی بدولت مغربی خیالات سے غزل گو شعرا متاثر ہوئے۔ قومی و ملکی مسائل غزلوں میں بیان کیے جانے لگے۔

شعرا نے سنجیدگی و پاکیزگی روحانیت و حقانیت آزادی و حریت قومیت و وطنیت اور تمام انسانی جذبات کو غزلوں میں بیان کیا ہے جن میں نزاکت و لطافت جوش و خروش درد و اثر، سوز و گداز، محبت و خلوص سادگی اور اصلیت سب کچھ موجود ہے۔

بیخود، سائل، ریاض، جلیل، مضطر نے قدیم رنگ سخن کی شمع روشن رکھی شاد، صفی، عزیز، اقبال، چکبست، سیماب، فانی، حسرت، جگر، اقبال سہیل، اصغر، جوش، فراق، ساغر، اثر، علا، نشور واحدی، علی سکندر وجد نے جدید خیالات کی آمیزش سے غزل میں چار چاند لگا دیے۔

ترقی پسند تحریک اور غیر ملکی شعر و ادب سے بھی اردو غزل متاثر ہوئی ۱۹۳۶ء کے بعد سے اردو غزل کا دامن اور وسیع ہو گیا اس میں جدید نظریات اور خیالات ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ نظم گو شعرا کو بھی اپنی ادبی بقا کے لئے غزل کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ فیض، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، وامق، مجاز،

مجذبی، تاباں، خلیل الرحمن اعظمی، جگناتھ آزاد سب نے غزلیں کہی ہیں۔

مثنوی

اُردو شاعری میں مثنوی سب سے زیادہ مفید اور وسیع صنف ہے۔ اس میں ہر قسم کے خیالات نظم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ مسلسل نظم ہے جس کے ہر شعر میں دونوں مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں یہ بیشتر چھوٹی بحروں میں اور کمتر طویل بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ مثنوی میں کم از کم یہ خوبیاں ہونا چاہیئے۔

۱۔ اشعار میں تسلسل ہو۔
۲۔ ایک بیان دوسرے بیان کے مطابق ہو۔
۳۔ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔
۴۔ ہر واقعہ رمز و کنایہ کے مطابق ہو۔
۵۔ کوئی واقعہ ناممکن غیر فطری اور مشکوک نہ ہو۔
۶۔ واقعہ لفظاً معناً نیچر اور عادت کے موافق ہو۔
۷۔ قصہ میں کوئی بات تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف نہ ہو۔
۸۔ ہر شخص کا ایک خاص کردار ہو اور اسی کے بموجب اس کے اوصاف بیان کیے جائیں۔
۹۔ مبالغہ اور لفظی صنعتیں زیادہ نہ ہوں۔
۱۰۔ موزوں الفاظ مناسب انداز بیان اور حسب موقع منظر کشی ہو۔

مثنوی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کی ابتدا اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ اکبر و جہانگیر کے عہد میں افضل میرٹھی نے کئی مثنویاں لکھیں دکن میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے شعرا غواصی، نصرتی اور ابن نشاطی نے مثنویاں لکھیں گولکنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ نے کئی مثنویاں لکھیں اس زمانہ میں فلسفیانہ، صوفیانہ، عاشقانہ، رزمیہ، طربیہ، بزمیہ، حزنیہ اور ہجویہ مثنویاں لکھی گئیں۔ شعرائے

متقدمین میں میر تقی میر، میر اثر، میر حسن نے مثنویاں لکھیں۔ میر حسن کی مثنوی کو شہرت دوام نصیب ہوئی۔ اس مثنوی میں زبان فطری اور سلیس ہے۔ اجزائے قصہ مناسب ہیں۔ تشبیہات و استعارات قریب الفہم ہیں۔ بیان میں نظم و تسلسل ہے۔ میر حسن نے واردات قلبیہ امور ذہنیہ اور جملہ مطالب کو سچے اور موثر پیرایے میں بیان کیا ہے۔

انیسویں صدی میں مومن کی عشقیہ مثنویاں، نسیم کی گلزار نسیم اور شوق کی زہر عشق زیادہ مشہور ہیں ان کے علاوہ طلسم الفت، حزن اختر، نالۂ تسلیم بھی مشہور ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر سے عشقیہ مثنویوں کی طرف شعراء کی توجہ کم ہو گئی۔ محسن کاکوروی نے صبح تجلی اور چراغ کعبہ لکھی، شوق قدوائی نے متعدد مثنویاں لکھیں۔ سنہ ۱۸۷۴ء سے مثنوی میں جدید رجحانات بڑی تیزی کے ساتھ آئے۔ آزاد اور حالی کی رہنمائی میں اس صنف کی افادیت اور اہمیت بڑھ گئی۔ ان میں وطنیت، قومیت نیچرل اور جدید رجحانات کا اضافہ ہوا۔ حالی کے بعد سے اردو مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ علمی و ادبی قومی و ملکی مثنویاں زیادہ لکھی جانے لگیں۔ تاہم مطالب عالیہ بیان کیے جانے والی مثنویوں کی بہت کمی ہے۔ اقبال کی مثنوی ساقی نامہ اس کمی کو ضرور پورا کرتی ہے۔ حفیظ جالندھری نے مثنوی شاہنامہ اسلام لکھی اس مثنوی میں آمد جوش اور اثر سب کچھ موجود ہے۔ مختلف علمی مسائل کے بیان کرنے کے لیے مثنوی نہایت بہتر اور کارآمد صنف ہے۔

مرثیہ

مرثیہ کے معنی "وصفِ میت" کے ہیں، اصطلاح شعرا میں مرثیہ وہ صنفِ سخن ہے جس میں کسی متوفی کی تعریف حسرت وغم کے ساتھ بیان کی جائے۔ مرثیہ کی کوئی شکل متعین نہیں، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند غرض ہر صنف میں مرثیہ لکھے گئے۔ مرثیہ کے اجزا حسب ذیل ہیں:-

۱۔ تمہید، ۲۔ سراپا، ۳۔ رخصت، ۴۔ آمد، ۵۔ رجز، ۶۔ واقعات جنگ، ۷۔ شہادت، ۸۔ بین، ۹۔ دعا۔

مرثیہ ادب اور شاعری کے اعتبار سے نہایت کارآمد اور اہم صنفِ سخن ہے وہ اردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی رزمیہ شاعری کو پورا کرتا ہے۔ مرثیہ جذبات نگاری، کردار نویسی اور منظر کشی کا بہترین مرقع ہے۔ اس میں ہر قسم کے مذہبی اور غیر مذہبی واقعات و روایات کا ذکر موجود ہے۔ اخلاقی شاعری کا بیش بہا خزانہ مرثیوں میں سب سے زیادہ ہے۔ زبان کی صفائی اور پاکیزگی سلاست و روانی کی طرف مرثیہ نگاروں نے خاص توجہ کی، روزمرہ محاورہ، صنائع لفظی اور معنوی حسنِ بیان اور جدت ادا مرثیوں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مناظر قدرت، جذبات فطرت اور واقعہ نگاری مرثیوں کی خصوصیت ہے۔

مرثیوں کی تاریخ بہت پرانی ہے، جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں نوری نے اردو میں مرثیے لکھے۔ دکن میں ہاشم و کاظم مرثیہ گوئی میں مشہور ہوئے دہلی کے قدیم شعرا نے بھی مرثیے لکھے مسکین، گدا، فضلی، امان، یکرنگ مشہور مرثیہ گو ہیں۔

مرثیہ کی ادبی حیثیت سودا کے زمانے سے قائم ہوئی مرزا سودا نے مربع

اور مسدس دونوں میں مرثیے لکھے۔ سودا کے زمانہ میں میاں سکندر کے مرثیہ بہت مشہور و مقبول ہوئے۔ میر تقی میر نے بھی مرثیے لکھے لیکن باوجود پیکر حزن و ملال کے مرثیہ گوئی میں میر کو شہرت نصیب نہ ہو سکی۔

مرثیہ کا روشن دور بناک دور میر ضمیر اور میر خلیق کے عہد سے شروع ہوتا ہے اس عہد میں میاں دلگیر اور فصیح بھی مشہور مرثیہ گو ہوئے ہیں۔ میر ضمیر نے مرثیہ میں وسعت پیدا کی اور حسب ذیل اضافے کئے۔

۱۔ رزمیہ لکھا، ۲۔ سراپا ایجاد کیا، ۳۔ اسلحہ جنگ و لوازمات جنگ کے اوصاف لکھے، ۴۔ غلط اور متروک الفاظ کو ترک کیا، ۵۔ جذبات نگاری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری پر زور دیا، ۶۔ قریب الفہم تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا، ۷۔ روایتیں نظم کرنا شروع کیں جس سے مرثیے کافی طویل ہو گئے۔

میر ضمیر اور میر خلیق نے ترتیب و تفصیل اور ایجادات سے مرثیہ کو اعلےٰ نظم اور زبان و بیان کا بہترین مرقع بنا دیا۔

میر ضمیر اور میر خلیق کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ان کی خداداد ذہانت اور صلاحیت سے مرثیہ کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ اس میں اتنی وسعت و جامعیت پیدا ہو گئی کہ جملہ اصناف سخن ہیچ ہو گئیں۔ مرثیہ کی بدولت اُردو شاعری اس قابل ہو گئی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ زبان سے آنکھیں ملا سکے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے علاوہ سید مرزا انس، حسین مرزا عشق، میر مونس بھی مشہور مرثیہ گو ہوئے ہیں۔

مرثیہ گو شعراء کے علاوہ دوسرے شعراء نے بھی شخصی یا ذاتی مرثیے لکھے، دہلی میں مومن اور غالب نے ترکیب بند غزل اور قطعہ کی شکل میں لکھنؤ میں نواب مرزا شوق نے

مثنوی کے اندر مرثیے لکھے، زہر عشق میں ماں نے اپنی اکلوتی بیٹی کی موت پر جو آنسو بہائے ہیں وہ مرثیہ کی بہترین مثال ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کا دور مرثیہ کا سنہرا دور تھا لیکن ان کے بعد مرثیہ گوئی کا چاند گہنا گیا تخت و تاج کے مالکوں کو قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا گیا۔ مرثیہ کے قدر دان اور سرپرست دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ اس لیے مرثیہ گوئی کا خاتمہ سا ہو گیا لیکن اس پریشان حالی میں بھی چند مرثیہ نگار خزاں آلود چمن کو اپنے خون جگر سے سینچتے رہے۔ میر خورشید علی نفیس، میر جلیس، سید علی محمد عارف، سید مرزا تعشق، پیارے صاحب رشید اور مرزا محمد جعفر اوج اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے رہے، میر نفیس نے ساقی نامہ اور پیارے صاحب رشید نے بہاریہ کا اضافہ کیا، ان کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی ملکی، قومی اور شخصی مرثیے لکھے۔ یہ مرثیے مسدس کے علاوہ قطعہ، ترکیب بند، غزل اور نظم کی صورت میں لکھے گئے۔ دلی کی تباہی پر متعدد مرثیے لکھے گئے، غالب کی وفات پر حالی نے دردناک مرثیہ لکھا غرض یہ دور مرثیہ کے انحطاط کے باوجود مرثیہ گوئی کی تمام خصوصیات رکھتا ہے اور مرثیہ میں آئندہ ہونے والی تبدیلیوں کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔

جدید دور میں ذاتی، شخصی، قومی اور ملکی مرثیے زیادہ لکھے جانے لگے، دوسری زبانوں کے مرثیوں کے ترجمے بھی کئے گئے، نظم طباطبائی نے ٹامس گرے کی مشہور نظم کا ترجمہ کیا جس نے مرثیہ کو ایک نئی شکل عطا کر کے نیا آہنگ دیا۔

ریاض، اقبال، نوبت رائے نظر، سرور جہان آبادی، چکبست، صفی، جوش، حفیظ جالندھری نے زیادہ تر ذاتی اور قومی مرثیے لکھے، تقسیم ہند کے بعد شعرا نے قوم و ملک کی تباہی کا مرثیہ غزلوں اور نظموں میں بھی لکھا، ملا نے مہاتما گاندھی کی شہادت

پر ایک دردناک مرثیہ لکھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کشتی پر بے شمار مرثیے لکھے گئے۔ اپنی مادری زبان کی تباہی اور بربادی پر سب نے گریہ و ماتم کیا ہے ان مرثیوں میں رزم و بزم، عزم و حوصلہ خودداری و خود اعتمادی شکوہ و شکایت سب کچھ موجود ہے۔

آل احمد سرور، علی سردار جعفری، روش صدیقی، جگناتھ آزاد اور دوسرے متعدد شعراء نے اُردو کشتی پر مرثیے لکھے ہیں۔ مرثیہ کا مستقبل مایوس کن نہیں ہے مغربی علوم اور دوسری زبانوں کے اثرات سے مرثیہ میں تنوع، وسعت اور افادیت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ہیئت اور شکل کے اعتبار سے بھی اس میں تبدیلی ہوتی جائے گی۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے

قصیدہ

قصیدہ کے لغوی معنی مغز اور گودے کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرع اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں اس میں کبھی کبھی مطلع ہوتے ہیں۔ عام طور پر قصیدے خطابیہ تمہیدیہ، بہاریہ، عشقیہ اور موعظیہ ہوتے ہیں چونکہ قصیدہ میں شاعر ارادتاً کسی کی مدح یا ذم یا کسی اور مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس لئے بھی اس کو قصیدہ کہا جاتا ہے۔

قصیدہ کے اجزاء :۔

۱۔ تشبیب یا تمہید۔ تشبیب سے وہ اشعار مراد ہیں جو قصیدے کی ابتدا میں تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں اس میں ہر قسم کے مضامین ادا کئے جاتے ہیں تشبیب میں جدت و ندرت ہونا چاہیئے اس کے اشعار مدح سے زیادہ

نہ ہوں نیز وہ ممدوح کے مرتبہ اور حیثیت کے بموجب ہوں۔

۲۔ گریز (جس کو تخلیص اور رجوع بھی کہتے ہیں) گریز قصیدے کا اہم حصہ ہے اس کا بڑا حسن یہ ہے کہ تشبیب کہتے کہتے شاعر مدح اس طرح کرنے لگے جیسے بات میں بات پیدا ہو گئی ہو۔

۳۔ مدح۔ شاعر ممدوح کے اوصاف بیان کرتا ہے مدح ممدوح کی حیثیت اور اس کے مرتبہ کی مناسبت سے کرنا چاہیئے۔

۴۔ دعا و مدعا۔ مدح کے بعد شاعر ممدوح کے لیئے دعا کرتا ہے اور اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔

قصیدے کی زبان پر شکوہ، لہجہ شاندار اور انداز بیان باوقار ہونا چاہیئے۔ نادر تشبیہات و استعارات اعلیٰ مقصد اور تسلسل مضامین قصیدے کی خصوصیات ہیں۔

اُردو شاعری میں قصیدہ کا وجود ابتدا سے ہے، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے قصیدے لکھے ہیں۔ نصرتی اور دوسرے دکنی شعراء نے بھی قصائد لکھے ہیں لیکن زبان و مضامین کے اعتبار سے ان کی اہمیت تاریخی زیادہ ادبی کم ہے۔

قصیدہ کا حقیقی دور مرزا سودا سے شروع ہوتا ہے زور بیان، شوکت الفاظ مضمون آفرینی، واقعہ نگاری، جوش، مدح ، نئی تشبیب، نرالی گریز میں سودا کا جواب نہیں لیکن مبالغہ غلو اور اغراق کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ابتذال بھی ہے ان کے ہجویہ قصائد بڑے زوردار ہیں۔

سودا کے بعد انشاء و مصحفی نے اچھے قصائد لکھے مضمون آفرینی اور بلند پروازی کے ساتھ ادق الفاظ، غیر معروف تلمیحات، سنگلاخ زمین میں انشاء، مصحفی سے آگے ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین اور راسخ عظیم آبادی نے بھی قصائد لکھے ہیں۔

سودا کے بعد ذوق قصیدہ گو کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ غالب نے قصائد میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ مومن نے زیادہ تر مذہبی قصائد لکھے انھوں نے انعام کے لئے کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ ذوق کے یہاں نیچرل سادگی، مصوری، الفاظ کی شان و شوکت ترکیبوں کی دلآویزی بندش کی چستی زیادہ ہے۔ غالب نے قصائد کے اندر تشبیب، گریز، مدح، دعا و مدعا سب میں جدت و ندرت پیدا کی۔

متاخرین میں بھی متعدد قصیدہ گو شعراء ہوئے ہیں ان میں منیر، امیر، داغ، جلال، تسلیم زیادہ مشہور ہیں ان کے قصائد میں بلند خیالی، نازک آفرینی، اور مبالغہ کی آمیزش پائی جاتی ہے، اس دور میں محسن کاکوروی مشہور ممتاز نعتیہ قصیدہ گو ہوئے ہیں۔

قصیدہ کی زندگی دربار اور درباداری سے وابستہ تھی جب تک نام کے بھی رئیس و نواب اور ان کے دربار قائم رہے قصیدہ گوئی جاری رہی لیکن جب یہ محفل برخاست ہوگئی تو قصیدہ گوئی کا بھی خاتمہ سا ہوگیا البتہ مذہبی اور بزرگان دین کی شان میں قصائد لکھے جانے لگے۔ حالی، اسمٰعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، نجم اکبرآبادی، سورج نرائن مہر، جلیل مانک پوری برج موہن دتاتریہ کیفی اور آرزو لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

رُباعی

ربع کے معنی چار ہیں چونکہ رباعی میں چار مصرع ہوتے ہیں اس لئے اس کا نام رباعی پڑا اس میں عام طور پر پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے تیسرا مصرع ہم قافیہ نہیں ہوتا ہے اس میں شاعر اپنا تخلص ڈالتا ہے۔ رباعی کا چوتھا

مصرع نہایت زوردار اور حاصلِ رباعی ہوتا ہے۔ رباعی اُردو کی نہایت مشہور ومقبول صنفِ سخن ہے اس میں ہر قسم کا مضمون حسن وعشق، اخلاق وتصوف، فلسفہ وتعلیم، عبرت وموعظت بیان کیا جاتا ہے انتخابِ الفاظ وترتیب بیان متین اور موزوں ہونا چاہیے۔ جو کچھ بیان کیا جائے اس میں جدت وندرت اختصار وجامعیت لطافت وپاکیزگی اور سلاست وروانی ہو۔

یوں تو ابتدا سے ہی رباعی کا وجود ہے سنہ ۱۱۰۰ھ سے قبل میر عبدالقادر حیدرآبادی نے رباعیاں لکھی ہیں لیکن رباعیات کا باقاعدہ آغاز، میر وسودا کے زمانہ سے ہوا۔ یہ دور غالب ومومن تک رہا۔ قریب قریب ہر موضوع اور مضمون پر رباعیاں لکھی گئیں لیکن یہ رباعیاں ضمنی طور پر لکھی گئیں۔ درد، میر حسن، حسرت، جرأت، انشا، مصحفی، رنگین، ذوق، مومن، غالب کی رباعیاں مشہور ہیں۔

رباعی کی ترقی کا زمانہ مرثیہ گو شعراء کے عہد سے ہوا مرثیہ گو شعراء نے شعوری طور پر رباعیاں لکھیں انیس ودبیر اور دیگر مرثیہ گو شعراء نے رباعیات کی طرف خاص توجہ کی، پیارے صاحب رشید کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

اُردو شاعری میں جب انقلاب واصلاح کا دور دورہ ہوا تو حالی اور اکبر رباعی کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے قومی، ملکی، اصلاحی، مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، سیاسی، سماجی غرض ہر موضوع پر رباعیاں لکھیں مواد اور موضوع نیز زبان وبیان کے اعتبار سے یہ رباعیاں اُردو ادب میں اہم اضافہ ہیں۔

حالی اور اکبر کے زمانہ ہی میں دوسرے شعراء رباعی لکھنے لگے ان کے بعد رباعی برابر ترقی کرتی رہی، اقبال، فانی، یگانہ چنگیزی، امجد حیدرآبادی، رواں سیماب، جوش، ملا، فراق مشہور وممتاز شعراء ہیں، جنھوں نے رباعیات میں

جملہ مسائل نئے انداز سے پیش کیے۔ فراق نے سنسکرت اور ہندی سے متاثر ہو کر رباعی کو نیا روپ دیا۔

رباعی کا مستقبل روشن ہے۔ علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ رباعی کی ترقی ہونا بھی ضروری ہے۔

قطعہ

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اس میں غزل یا قصیدہ کی طرح مطلع نہیں ہوتا ہے صرف قافیہ یا ردیف کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قطعہ کے اشعار میں تسلسل بیان ہونا لازمی ہے ان اشعار کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ ۲۵ ہونا چاہیے عام طور پر طویل نظمیں قطعہ کی صورت میں نہیں لکھی جاتیں۔

قطعہ میں ہر قسم کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں مگر زیادہ تر اخلاقی اور نصیحت آمیز باتیں قطعوں میں لکھی جاتی ہیں مضمون اور موضوع کے اعتبار سے زبان و بیان کا ہونا ضروری ہے۔

قطعہ کا رواج ابتدا میں نہیں تھا غزل یا قصیدے میں جب کوئی مطلب ایک شعر میں ادا نہیں ہوتا تھا تو دو یا تین یا اس سے زائد اشعار میں وہ مطلب ادا کر دیا جاتا تھا ان اشعار کو قطعہ کہا جاتا تھا میر و سودا، نظیر اکبر آبادی، کے علاوہ دوسرے شعراء نے بھی قطعات لکھے ان شعراء کے بعد غالب کے قطعات مشہور ہیں غالب ہی کے زمانہ سے ان کے مشہور شاگرد حالی نے قطعات کی طرف خاص توجہ کی اور مستقل صنف کی حیثیت دی۔ چنانچہ حالی کے معاصرین شعراء نے قطعات خاص طور سے لکھے۔ اکبر، شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد، سلیم پانی پتی، شاد عظیم آبادی، سب نے قطعات لکھے ہیں۔

یہ قطعات، اُردو کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ اقبال، جوش، اختر شیرانی اور دوسرے شعراء کے قطعات اُردو ادب کو نئی زندگی نیا جوش اور نیا ولولہ دے رہے ہیں۔

رباعی کی طرح قطعات کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے ان کا مستقبل بھی شاندار ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ قطعات نے اُردو شاعری کو وسعت اور گہرائی سنجیدگی اور متانت بلندی اور آفاقیت، اختصار اور جامعیت عطا کی ہے۔

جدید نظم

جدید نظم کوئی خاص صنف نہیں ہے اُردو شاعری میں نئے نئے موضوعات پر نظمیں لکھنا جدید رجحانات کو شاعری کا جامہ پہنانا داخلی کیفیات، خارجی واقعات مناظر قدرت، جذبات فطرت، واقعات و تمثیلات، وطنیات و قومیات اور انسانی رجحانات نیز عصری میلانات کو بیان کرنا جدید شاعری ہے۔

جدید شاعری کی ابتدا قدیم شاعری ہی سے ہے محمد قلی قطب شاہ نے ترکاریوں اور پھلوں وغیرہ پر نظمیں دکنی زبان میں لکھیں۔ متقدمین شعراء میں مرزا سوداؔ اور میرؔ نے مناظر قدرت اور مظاہر فطرت واقعات اور حادثات پر نظمیں لکھی ہیں۔

جدید شاعری کے باوا آدم نظیر اکبر آبادی ہیں جنھوں نے صدہا نظمیں قدرتی مناظر، اخلاق و نصائح، مقامی و ملکی مشاغل حیات، سماجی و اقتصادی حالات پر نہایت وضاحت کے ساتھ لکھیں۔ زبان و بیان کی عمومیت کی وجہ سے ایک عرصہ تک اِن کی تخلیقات ادبی مرتبہ حاصل نہیں کرسکیں لیکن جدید ادبی نظریات و رجحانات کی توسیع و اشاعت کے ساتھ ساتھ نظیرؔ کی شاعرانہ عظمت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور انھیں جدید شاعری کا باوا آدم تسلیم کیا جانے لگا۔

جدید شاعری کے متعلق شعوری طور پر کوشش ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوئی مغربی علوم و فنون نے مشرقی علوم و فنون کی وقعت کم کردی نظریات میں تبدیلی آئی جدید رجحانات پیدا ہوئے، مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۶۷ء میں سب سے پہلے اپنے ایک لیکچر میں اس طرف توجہ دلائی ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۴ء تک مسلسل یہ کوشش جاری رہی۔ بالآخر ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ایک بزم مناظمہ قائم ہوئی۔ جس میں نیچرل مضامین پر نظمیں لکھی گئیں۔ آزاد اور حالی اس بزم کے روح رواں تھے اس کے بعد ہی اردو شعراء جدید رجحانات اور میلانات کو نظم کا جامہ پہنانے لگے اور جدید شاعری پروان چڑھنے لگی۔ اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الٰہ آبادی، ڈاکٹر نذیر احمد، شوق قدوائی، شبلی نعمانی قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے جدید شاعری کو استحکام اور عروج نصیب ہوا، مغربی زبانوں کی نظموں کے ترجمے کئے جانے لگے۔ مغربی خیالات کو نظم کیا جانے لگا نظم کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے اس میں وسعت آئی سیاسی، سماجی، قومی، ملکی اور دیگر مسائل حیات پر مربوط اور مسلسل اشعار میں اظہار خیال کیا جانے لگا، شکل اور موضوع کے لحاظ سے نظم لکھنے میں طرح طرح کی جدتیں اور خیال آفرینیاں کی جانے لگیں۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد جدید شاعری نے نئی کروٹ لی، صور حبّ قومی نے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کیا، حریت و آزادی کے جذبات بیدار ہوئے لہجے میں آزادی دبیبا کی آئی، سلیم پانی پتی، چکبست، علامہ اقبال، سیماب اکبری نوبت رائے نظر، ظفر علی خاں، درگا سہائے سرور، نظم طباطبائی، صفی لکھنوی، اختر شیرانی، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، افسر میرٹھی، فراق گورکھپوری، اروش صدیقی

ساغر، آنند نرائن ملاّ، آل احمد سرور کی مساعی قابل ذکر ہیں۔

۱۹۳۶ء کے قریب مغرب کی جدید معاشی و سیاسی تحریکات سے شعرا بجد متاثر ہوئے ترقی پسند تحریک نے جدید شاعری کو نئے نظریات دیے انھیں نظریات کو نظم کیا جانے لگا آزاد اور معریٰ نظمیں لکھی جانے لگیں کہیں کہیں جذبات میں عریانی اور لہجے میں تلخی آئی زبان و قواعد کے اصول توڑے گئے آزاد خیالی بے راہروی کی حد تک پہونچ گئی تاہم اردو شاعری ان خارزار وادیوں میں بھی گلہائے رنگا رنگ کھلاتی رہی۔ موضوع، مواد، ہیئت، اسلوب اور خیال کے اعتبار سے اس میں وسعت و جامعیت ہمہ گیری و افادیت پیدا ہوئی اس کو نیا آہنگ اور نیا لہجہ ملا جس میں دلکشی و رعنائی کے ساتھ ساتھ زندگی و توانائی پائی جاتی ہے۔ ن۔ م۔ راشد، میراجی، جاں نثار اختر، مجاز، مخدوم، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، وامق جونپوری، خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری اردو کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ جدید شاعری کا مستقبل ہر حیثیت سے روشن ہے

اردو شاعری کے اسکول

اردو شاعری مختلف مقامات پر پروان چڑھی جن میں دلّی، لکھنؤ، رام پور، حیدرآباد، بھوپال، عظیم آباد (پٹنہ)، مرشد آباد، لاہور قابل ذکر ہیں۔ لیکن مرکزی حیثیت صرف دہلی اور لکھنؤ کو حاصل رہی یہیں کے لوگ اہل زبان کہلائے اور یہیں کی زبان ٹکسالی سمجھی گئی۔

شعرائے دہلی اور لکھنؤ زبان و بیان اور طرز فکر میں مختلف نقطۂ نگاہ رکھتے تھے جو دونوں شہروں کے مزاج اور حالات کے تقاضوں کا نتیجہ تھا رفتہ رفتہ اس اختلاف نے مستقل ادبی حیثیت اختیار کرلی اور اس کی باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جانے لگی۔ اس

طرح شاعری کے دو باقاعدہ اسکول دہلی اور لکھنؤ قائم ہو گئے۔ بعد میں آسخ عظیم آبادی، اور شاد عظیم آبادی نے دہلی طرز تخیئل کو لکھنوی زبان کے ساتھ ملا کر عظیم آباد میں ایک تیسرے اسکول کی بنیاد ڈالی جس کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی البتہ جدید نظریات اور رجحانات نے شاعری میں ایک جدید اسکول کا اضافہ کیا اس طرح شاعری کے تین باقاعدہ اسکول ہو گئے۔ دہلی اسکول۔ لکھنؤ اسکول۔ جدید اسکول۔

ہر اسکول کی خصوصیات مختصراً حسب ذیل ہیں :-

دہلی اسکول

۱۔ طرز بیان سادہ سلیس اور فطری ہے۔

۲۔ الفاظ سے زیادہ خیالات کی صفائی اور پاکیزگی پر زور دیا جاتا ہے۔

۳۔ معاملات اور واقعات کو سچائی اور اصلیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

۴۔ جذبات حقیقی اور اعلےٰ ہوتے ہیں۔

۵۔ جدید معنی خیز ترکیبیں، لطیف استعارے اور نادر تشبیہیں استعمال کی جاتی ہیں۔

۶۔ اخلاق و تصوف کا رنگ نمایاں طور پر ہوتا ہے۔

۷۔ روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی موجود ہے۔

۸۔ جوش بیان کے ساتھ سوز و گداز اور درد و اثر پایا جاتا ہے۔

۹۔ رعایت لفظی اور مبتذل مضامین بہت کم ہیں۔

۱۰۔ مختصر غزلیں ہوتی ہیں جن میں ابتذال و ثقالت سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ اسکول

۱۔ خیالات سے زیادہ الفاظ اور زبان کی لطافت پر زور دیا جاتا ہے۔

۲۔ بے لطف مضمون آفرینی کی وجہ سے طرز بیان میں سادگی کم ہو جاتی ہے۔

۳۔ رعایت لفظی کی بہتات ہے۔

۴۔ زنانہ زبان اور محاورات کے استعمال کا شوق بے انتہا ہے۔

۵ - معاملہ بندی نے شاعری کو متبذل اور بازاری بنا دیا۔

۶ - محبوب کے سراپا لباس اور طرزِ معاشرت کا ذکر کرنا مہذب اور عریاں الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

۷ - دہلی اسکول کی طرح جذبات اور تخیل میں بلندی اصلیت اور پاکیزگی نہیں ہے۔

۸ - اخلاق و تصوف اور روحانی جذبات دہلی کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔

۹ - تصنع اور تکلف نے کلام میں درد و اثر نہیں رکھا ہے اگر ہے تو بہت کم ہے۔

۱۰ - طویل غزلیں، جتنے کہ دو غزلہ سہ غزلہ لکھنے کا شوق ہے جس میں ثقیل الفاظ کا استعمال بھی ہو جاتا ہے۔

جدید اسکول: الفاظ و بیان اور خیال کے اعتبار سے جدید اسکول کا میدان نہایت وسیع ہے۔ شاعری صرف گل و بلبل، عشق و حسن اور خیالی باتوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس میں شاعرانہ تخیل اور اسلوب کے ساتھ اخلاق، فلسفہ، تصوف، سیاست کے جیسے اہم موضوع بھی بیان کیے جانے لگے۔ جدید اسکول میں۔

۱ - شاعرانہ انداز بیان میں کسی علم و فن کا کوئی نکتہ بیان کیا جاتا ہے۔

۲ - مضمون بظاہر شاعرانہ یا عاشقانہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس میں فلسفہ، اخلاق یا نفسیات کا کوئی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔

۳ - جدید الفاظ کے استعمال میں آزاد خیالی ہے اس لیے اکثر غیر مروج اور نامانوس الفاظ کا بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

۴ - انداز بیان نہایت لطیف اور نازک دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔

۵ - خیالات زیادہ تر حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔

۶ - جدید معنی خیز ترکیبیں، نادر اور قریب الفہم تشبیہیں اور استعارے روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی موجود ہے۔

۷ - نظر میں وسعت، تخئیل میں رفعت اور بیان میں ندرت، پائی جاتی ہے جو اس عمومیت افادیت اور جامعیت کے ساتھ پہلے کبھی نہیں تھی۔

مشاہیر شعرائے اُردو

متقدمین

ولی گجراتی

۱۶۶۸ء تا ۱۷۰۷ء

محمد ولی اللہ نام، ولی تخلص، شریف محمد علوی کے بیٹے ۱۶۶۸ء میں احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ شاہ وجیہ الدین کے مدرسہ میں شیخ نور سہروردی سے تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی سے سیاحت کے شائق اور تصوف کی طرف مائل تھے۔ شاعری میں ولی شاہ سعد اللہ گلشن دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور انھیں کی ہدایت پر ریختہ کی طرف توجہ کی۔

ولی صرف ایک بار ۱۱۱۲ھ میں دلی آئے۔ دلی میں ان کا دو مرتبہ آنا غلط ہے۔ یہ غلطی اس شعر کی وجہ سے اور بھی ہوئی جو ولی کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

لیکن یہ شعر ولی کے دیوان میں نہیں ہے۔ درحقیقت یہ شعر مضمون کا ہے جس کا پہلا مصرع اس طرح ہے۔

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

البتہ ولی کا دیوان ۱۱۳۲ھ میں محمد شاہ کے زمانہ میں پہونچا تھا۔ ولی کا انتقال عصر کے وقت ۱۲ر شعبان ۱۱۱۹ھ مطابق ۲۰ر اکتوبر ۱۷۰۷ء پیر کے دن احمد آباد میں ہوا۔ مفتی محمد احسن نے قطعہ تاریخ کہا۔

سال فاتش خرد از سر الہام گفت　　بادشاہ ولی، ساقی کوثر علی

اُردو شاعری میں ولی کو وہی مرتبہ اور اہمیت حاصل ہے جو فارسی میں رودکی کو، عربی میں مہلہل کو اور انگریزی میں چاسر کو ہے۔ ان کی شاعری حقیقی جذبات و احساسات، صداقت و اصلیت، درد و اثر، وجد و کیف، سوز و گداز کی ترجمان ہے، ان کا تخیل بلند اور نازک ہے۔ ان کی زبان شستہ و پاکیزہ ہے جو فارسی کی خوبصورت ترکیبوں اور ہندی فارسی کے منتخب الفاظ کی آمیزش سے دلکش و شیریں ہو گئی ہے۔

لطیف تشبیہیں، نازک استعارے، شیریں الفاظ، حسین ترکیبیں، ان کے کلام کی جان ہیں، ان کا شگفتہ تغزل اور پرکیف اسلوب بیان دلوں کو موہ لیتا ہے، ان کی شاعری اخلاق و تصوف کے نکات اور عشق و حسن کے معاملات سے معمور ہے۔ غزلوں میں برجستگی و سادگی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز اور قصائد میں شوکت الفاظ زور اور روانی موجود ہے۔

ولی کی اولیت :۔ اُردو غزل گوئی کا رواج شمالی ہند میں عموماً اور دلی میں خصوصاً ولی کی بدولت ہوا۔

اُردو میں سب سے پہلے دیوان مرتب کیا۔

دکنی زبان اور شمالی ہند کی زبان کے حسین امتزاج کی وجہ سے ولی کا کلام دونوں جگہ مقبول ہوا۔ ابتدا میں ولی کے کلام میں دکنی الفاظ اور مقامی محاورات کا غلبہ ہے۔

میں دکھ کر اپس کے مکھ کی بات ۔۔۔ علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

جب باج مرے سینہ پہ ہر آن ہے یک سال ۔۔۔ اس ماہ بنا تن ہے مرے پاس نہ آیا

فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی کثرت بھی پائی جاتی ہے۔

مسند گل منزلِ شبنم ہوئی ۔۔۔ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

دیکھنا تجھ تن کا اے نازک بدن ۔۔۔ باعث خمیازۂ آغوش ہے

آخر میں زبان نرم و شیریں، سادہ اور سلیس ہو گئی۔

جلوہ گر جب سے وہ جمال ہوا ۔۔۔ نور خورشید پائمال ہوا

خوب رو خوب کام کرتے ہیں ۔۔۔ اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

زندگی جام عیش ہے لیکن ۔۔۔ فائدہ کیا اگر مدام نہیں

ولی اردو کے پہلے باقاعدہ صاحب دیوان ہیں۔ انھیں کے دم سے اردو شاعری کا چمن سرسبز و شاداب ہوا۔

فائز دہلوی

صدر الدین محمد نام فائز تخلص تھا۔ یہ ولی کے ہمعصر تھے۔ ان کا دیوان ۱۱۲۷ھ / ۱۷۱۵ء میں مرتب ہو چکا تھا۔ اردو و فارسی دونوں میں کامل دستگاہ تھی۔ نظم و نثر دونوں لکھتے تھے۔ ابھی تک ان کی تصانیف کی تعداد انیس ۱۹ معلوم ہو سکی ہے۔

اردو دیوان میں صرف بتیس ۳۲ غزلیں ہیں۔ نظموں کی تعداد غزلوں سے زیادہ ہے۔ فائز کو دہلی کا پہلا اردو غزل گو اور نظم گو تسلیم کیا گیا ہے۔ کلام میں سادگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ صنائع و بدائع بھی موجود ہیں۔ ان کے کلام کی خاص خصوصیت مقامی رنگ ہے۔ وہ تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں میں بیشتر ہندوستانی چیزوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً پلک کو کٹاری سے، بڑی بڑی آنکھوں کو کنول کے پھول سے، دلکش رفتار کو مور اور مست ہاتھی کی چال سے تشبیہ دیتے ہیں۔
ان کی غزلوں کا عام موضوع، ظاہری حسن اور مجازی محبت ہے۔

غمزہ، نگہ، تغافل، انکھیاں سیاہ چنچل ۔۔۔ یارب نظر نہ لاگے انداز ہے سراپا

جل کے میں سرمہ ہوا بلکہ ہوا کاجل بھی
خانۂ چشم میں تجھ پاؤں جو ٹک راہ مگر

گردش چشم سوں سرِ یجن سب
بزم میں کار جام کرتے ہیں

مخلص اپنے کو نہ مارو نا حق
حق اخلاص بھلایا نہ کرو

خاکساراں کوں نہ کر یے پامال
جگ میں فرعون سی خدائی نہ کرو

قہر و لطف و تبسّم و خندہ
تیری ہر اک ادا پیارنی ہے

یار میرا میان گلشن ہے
غرق خوں پھول تا بدامن ہے

مضمون

متوفی ۱۷۴۵ء

شیخ شرف الدین مضمونؔ آگرہ کے قریب موضع جاج مئو میں پیدا ہوے آغاز شباب سے ہی دلی چلے آئے۔ زینت المساجد میں قیام کیا۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی تھی۔ میرؔ نے ان کو "ہنگامہ گرم کن مجلسہا" لکھا ہے۔ خان آرزو سے مشورہ سخن کرتے تھے۔

کلام پاکیزہ اور پر لطف ہے اور اس زمانہ کے مطابق صنعت مراعاۃ النظیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اکثر جگہ فحش اور ابتذال کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ میرؔ ان کو "خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا مشاق" لکھتے ہیں۔

سوداؔ، اور میر حسنؔ نے بھی ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ دو سو اشعار پر مشتمل ایک دیوان یادگار ہے۔ ۱۱۵۸ھ ۱۷۴۵ء میں انتقال کیا۔ مرزا سوداؔ نے کہا۔

بتائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمونؔ دنیا سے رہا سوداؔ سو دیوانہ

مضمونؔ کے کلام کا رنگ یہ ہے:۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوبؑ کیا گریۂ یعقوبؑ کیا

کرے ہے دار بھی کامل کو سر تاج ۔۔۔ ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں ۔۔۔ ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جورِ باغباں

میرا پیغامِ وصل اے قاصد ۔۔۔ کہیو سب سے اُسے جدا کرکے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے ۔۔۔ کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

عمدۃ الملک امیر خاں انجامؔ

متوفی ۱۷۴۷ء

انجامؔ کا شمار مصلحین اُردو میں کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں الہ آباد کے صوبہ دار تھے۔ عربی فارسی کے عالم فاضل۔ بھاشا اور سنسکرت کے استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ طبیعت بذلہ سنج پائی تھی، فارسی اور اُردو دونوں میں فکر سخن کرتے تھے، انھوں نے سب سے پہلے اُردو زبان کی ترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی جس میں الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بحث و مباحثہ کے بعد جن الفاظ پر سب کا اتفاق ہوتا وہ انجمن کے دفتر میں درج کر لئے جاتے اور پھر سارے ہندوستان میں اس کی نقل بھیج دی جاتی۔

محمد شاہ کے اشارے سے ۲۶ر دسمبر ۱۷۴۷ء کو ایوان شاہی میں انجام قتل کر دیے گئے ان کا نادر کتب خانہ بھی برباد کر دیا گیا جس میں ان کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔

ان کا کلام، لطافت و پاکیزگی اور فصاحت و سلاست میں بے مثل ہے، روزمرہ اور محاورہ کی صفائی و درستی ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اسلوب بیان میں جدت و ندرت، دلکشی و رعنائی پائی جاتی ہے۔

دُور سے آئے تھے ساقی سُن کے میخانے کو ہم ۔۔۔ پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

تک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

سید محمد شاکر ناجیؔ

سید محمد شاکر ناجیؔ، عمدۃ الملک امیر خاں کے یہاں ملازم تھے۔ دلی اور شاہ آبروؔ کے ہم عصر تھے۔ نادر شاہ درانی کے حملے کے وقت (۱۷۳۹ء) میں موجود تھے۔ دلی کی تباہی و بربادی اور قتل و خونریزی کا سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جس کو ایک مخمس میں بیان کیا ہے۔

تیز مزاج، شوخ طبع اور ظریف انسان تھے۔ بقول میرؔ طبیعت کا رجحان ہزل کی طرف زیادہ تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود مُنھ بنائے رہتے۔ موت نے جوانی ہی میں دنیا سے اٹھالیا۔

ان کے کلام میں سلاست زبان اور نزاکت خیال کے ساتھ ساتھ استعارات وایہام کی کثرت ہے۔ رعایت لفظی بھی پائی جاتی ہے۔ شاہ مبارک آبروؔ نے ان کی شیریں زبانی کی تعریف کی ہے۔

سخن سنجاں میں سب ہے گا آبروؔ آج
نہیں شیریں زباں شاکر سری کا

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

مجھ کو باتوں ہیں لگا کیا جانیے کیا کہہ گیا
لے چلا جب دل تئیں مُنھ دیکھتا میں رہ گیا

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشمِ کرم
لب صد مے کے تر نہیں ہر چند ہے گو ہر میں آب

نہ سیرِ باغ، نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں
یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

آج تو ناجی سجن سے کرلے اپنا حال عرض | مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہونی ہو سو ہو
اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں | عارضی میری زندگانی ہے

شاہ مبارک آبرو

متوفی سنہ ۱۷۵۰ء

نجم الدین نام، شاہ مبارک لقب اور آبرو تخلص تھا۔ گوالیار میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں دلی چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۷۵۰ء میں انتقال کیا۔

کلام میں صفائی بھی ہے اور محاوروں کی چاشنی بھی، استعارات اور ایہام کے بادشاہ ہیں۔ کلام کہیں کہیں سبک اور مبتذل ہو گیا ہے۔ میر حسن، مصحفی وغیرہ جیسے باکمال اساتذہ ان کے مداح ہیں۔

صاحب دیوان تھے مگر دیوان زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا[1]۔ ایک مختصر دیوان کہیں کہیں پایا جاتا ہے، ایک مثنوی "آرائش معشوق" بھی لکھی ہے نمونۂ کلام یہ ہے:-

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہئے | کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا
یہ سبزہ، یہ آب رواں، اور یہ ابر گھرا | دیوانہ نہیں گھر میں رہوں چھوڑ کے صحرا
جلتا ہے اب تلک تری مکھڑے کے رشک سے | ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گل
حسن ہے پر خوبرویوں میں وفا کی خو نہیں | پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

---

[1] قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ (دیسنا لائبریری سکشن) میں موجود ہے۔

کریں جو بندگی ہوویں گنہگار بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے وہ ہائے عاشقی کے زمانے کدھر گئے

مرزا داؤد

متوفی ۱۷۵۴ء

مرزا داؤد نام داؤد تخلص اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی یہ بھی ولی سے متاثر تھے۔ خود کہتے ہیں۔

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر تجھ طبع میں داؤد، ولی کا اثر آیا

ان کا دیوان کم وبیش پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ کلام میں سادگی وشیرینی اور بیان میں رنگینی ودلکشی ہے۔

اس صنم کے خیال ابرو نے ناتواں مجھ کو جوں ہلال کیا

ہوا ہے ابر گریاں دیکھ میری چشم گریاں کو پڑا ہے شور دریا میں مرے اشک جاری کا

دست رنگیں کو دیکھ کر تیرے رنگ مہندی چھپا ہے باتوں بات

مرا احوال چشم یار سے پوچھ حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

اے زاہداں اٹھاؤ جبینوں کو زمیں سے جو سرنوشت ہے اسے کاں تک مٹاؤ گے

۱۱۶۸ھ م ۱۷۵۴ء میں وفات پائی۔ لچھمی نرائن شفیق نے تاریخ کہی۔

بلبل گلزار معنی طوطی رنگیں بیاں از غم آباد جہاں بگذشت چوں تیر از کماں

مصرع تاریخ فوتش گفت با من ہاتفے گو برفتہ میرزا داؤد فانی از جہاں

خان آرزو

۱۶۸۹ء - ۱۷۵۶ء

سراج الدین علی خان نام آرزو تخلص۔ اردو فارسی دونوں کے استاد تھے۔ میر تقی میر نے ان کو سب سے بڑا محقق اور شاعر، میر حسن نے امیر خسرو کے بعد سب سے بڑا شاعر، اور فتح علی نے "چراغ محفل فصاحت" تسلیم کیا ہے۔ آرزو اردو میں کم کہتے تھے۔ مگر ان کو سب نے استاذ الاساتذہ تسلیم کیا ہے۔

بچپن ہی سے عروس سخن کے گیسو سنوارنے لگے، ان کی قابلیت، طباعی، ذہانت، قوت، اختراع، فصاحت و بلاغت نے ایک عالم کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔

نادر شاہ کے حملے سے دہلی شہر تباہ و برباد ہو گیا، یہ بھی لکھنؤ چلے آئے، اور یہیں ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ مگر لاش دہلی ہی میں دفن کی گئی۔

آرزو نے متعدد کتابیں لکھیں، فارسی دیوان جس میں تیس ہزار اشعار ہیں، سکندر نامہ قصائد عرفی اور گلستان سعدی کی شرح، سراج اللغات فارسی میں، غرائب اللغات اردو میں، موہبت عظمیٰ، عطیہ کبریٰ، مجمع النفائس یا تذکرہ آرزو یادگار ہیں۔

آرزو کا اردو کلام کم یاب ہے لیکن جو کچھ موجود ہے اس سے ان کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ زبان و بیان دونوں میں جدت و ندرت ہے۔

کھول کر بند قبا کو ملک دل غارت کیا   کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں کیا

آتا ہے ہر سحر اٹھ تیری برابری کو   کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے   چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

انعام اللہ خاں یقین

سنہ ۱۷۳۱ء - سنہ ۱۷۵۶ء

نواب انعام اللہ خاں یقین، نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے تھے سنہ ۱۷۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا، میرزا مظہر جانجاناں سے اصلاح سخن لیتے تھے، خوشرو، خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے۔ پچیس سال کی عمر تھی باپ نے کسی بات پر خفا ہو کر قتل کر دیا۔

یقیں مارا گیا جرم محبت میں زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اسکو کہتے ہیں

یقین کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے شستہ و پاکیزہ، دلکش و شیریں، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی شاگردی نے زبان و بیان کا جوہری بنا دیا، کلام کی شوخی اور طرز ادا شعر میں دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ ایک قافیہ کو مختلف پہلو سے مختلف ردیفوں میں جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

دیوان میں کل ایک سو ستر غزلیں ہیں، اور ہر غزل میں صرف پانچ اشعار ہیں۔ کہیں کہیں صنعت ایہام بھی ہے۔ مگر مجموعی حیثیت سے کلام نمکین بامزہ اور پر تجربہ ہے۔

جو کچھ کہیں ہیں تجھ کو یقیں ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچہ کا
چمن پر کیا ستم کرتا ہے اے باد صبا کوئی

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

میر سراج الدین سراج

۱۷۱۲ء - ۱۷۶۴ء

سراج الدین نام سراج تخلص اورنگ آباد میں ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی، پہلے فارسی میں پھر ریختہ میں شعر کہنے لگے۔ ان کے پیر بھائی عبدالرسول خاں نے دیوان مرتب کیا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ولی کے بعد دکن میں اس پایہ کا شاعر نہیں ہوا۔ خود کہتے ہیں۔

تجھ بنا اے سراج بعد ولی — کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

خوش فکر، سنجیدہ مزاج اور صاحب دل تھے۔ زبان میں لطافت و پاکیزگی ہے بیان میں حسن و دلکشی ہے۔ ولی نے زمین شعر پر جو پودے لگائے تھے سراج نے ان کو سرسبز و شاداب کیا۔ دیوان ریختہ کے علاوہ ایک فارسی کا دیوان ایک مثنوی تصوف میں اور ایک فارسی شعراء کے دیوانوں کا انتخاب ان کی یادگار ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

شکر للہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا — شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں — لوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

ایک مشہور غزل کے چند اشعار:-

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا — مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کو — نہ خطر رہا نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

۴ شوال جمعہ ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۴ء وفات پائی۔

عارف الدین خاں عاجز

متوفی ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء

عارف الدین خاں عاجز بچپن ہی سے یتیم ہو گئے۔ نواب لشکر خاں کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی، اور انھیں کے ساتھ اورنگ آباد آ کر آصف جاہ اول کے یہاں ملازم ہو گئے۔ ۱۱۸۰ھ میں نانڈیڑ میں انتقال کیا۔

مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی تھی، شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا، فارسی اور اُردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کلام عموماً صاف اور سلیس ہے۔ البتہ ایہام گوئی اور ذو معنین کا بھی شوق ہے۔

اُردو میں ان کا ایک دیوان اور ایک مثنوی دل و گوہر موجود ہے۔ فارسی میں بھی ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

باغ میں اس لالہ رو کے آہ جب جاتے ہیں ہم — دل کے داغوں کو گلوں کے تازہ کر آتے ہیں ہم
چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے — گلوں سے رنگ اڑ کر لالہ سا جنگل کو جاتا ہے
ہمارا اشک خونیں یاد میں گلرو کے بہہ بہہ کر — نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بناتا ہے

مثنوی کی زبان نہایت صاف، سادہ اور رواں ہے۔

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی — عطا کر مجھ کو یاقوت بیانی
سخن کے دُر کا مجھ کو جوہری کر — سخن سنجوں کو میرا مشتری کر
سخن کا لال دے میری زباں کو — دُرِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

اشرف علی خاں فغاں

متوفی ۱۷۷۲ء

اشرف علی خاں فغاں احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے بادشاہ نے "ظریف الملک کوکا خاں بہادر" کا خطاب دیا تھا۔ بقول میر تقی میر شاعری میں قزلباش خاں اُمید کے شاگرد تھے لیکن مصحفی نے ندیم کا شاگرد لکھا ہے۔ خود فغاں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں — دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہووے گا

ہو سکتا ہے کہ دونوں کی شاگردی کا فخر انھیں حاصل ہو۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے نے دلّی کو تباہ و برباد کیا، فغاں مرشد آباد چلے گئے راجہ شتاب رائے نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی، فغاں آخر دم تک وہیں رہے ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں انتقال کیا۔

کلام صاف اور پاکیزہ، خیالات نازک اور بلند، زبان صاف اور رواں ہے، ایہام گوئی، ابتذال، فحش الفاظ و خیالات سے پرہیز کرتے ہیں فارسی اور ہندی کے محاورات کو نہایت خوبی سے ایک ساتھ نظم کیا ہے۔

ایک دیوان اردو تقریباً دو ہزار اشعار کا جو غزلیات، قصائد، قطعات، رباعیات اور مخمس پر مشتمل ہے اور ایک دیوان فارسی کا یادگار ہے۔ میر نے ان کو "جوانِ قابل و ہنگامہ آرا" لکھا ہے۔ سودا بھی ان کے کلام کے معترف ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا — ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا

دل بستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے
گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا

نے زندگی میں وصل میسر نہ بعد مرگ
عاجز ہوا ہوں اے دلِ ناشاد کیا کروں

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو لے نامہ بر کہیں

تیرے ہی دل سے پوچھیے اس غم کو ہاں وفا
الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

غلام مصطفٰے خاں یکرنگ

غلام مصطفٰے خاں یکرنگ محمد شاہی امرا میں نہایت معزز و محترم تھے' ان کا شمار باکمال شعرا میں کیا جاتا ہے، کہن سال اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خان آرزو یا شاہ آبرو کے شاگرد تھے۔ مگر خود انھوں نے مرزا مظہر جان جاناں کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے۔

یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے
مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

ان کا رنگ سخن شاہ مبارک آبرو اور میاں مضمون سے متاثر ہے۔ کلام میں بلندی ہے لیکن استعارات کی بھرمار ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کی چاشنی موجود ہے۔ ایک دیوان یادگار ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:—

اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی
ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

کم نہیں کچھ بوئے گل سیتی فغانِ عندلیب
برگِ گل سے ہے گی نازک تر زبانِ عندلیب

سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

ہر گز تم اب کسو کے سجن آشنا نہیں
سب خوبیاں ہیں تم میں ولیکن وفا نہیں

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
دل سے صبر و قرار جاتا ہے

تاریخ ولادت و وفات کا پتہ نہیں چل سکا۔

مرزا مظہر جان جاناں

۱۱۱۱ھ ـــ ۱۱۹۵ھ

شمس الدین جانجاناں نام مظہر تخلص تھا ان کے والد مرزا جان عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے، کالا باغ علاقہ مالوہ میں ۱۱ رمضان ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۷۰۰ء سہ شنبہ کو پیدا ہوئے۔ عالمگیر نے سن کر فرمایا کہ "پسر جان پدر می باشد" اس کا نام ہم نے "جان جان" رکھا۔ "جان جان" کثرت استعمال سے "جان جاناں" ہو گیا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مگر شفقت خداوندی رہنما ہوئی اہل علم سے علم حدیث اور فقہ حاصل کیا۔ تیس برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جاروب کشی کی، مزاج میں قناعت و استغنا اور خودداری اتنی تھی کہ امرا اور بادشاہوں کی بھی نذریں قبول نہ کرتے تھے۔ درویش کامل اور صوفی صاحب دل تھے، ہزاروں ہندو مسلمان مرید تھے۔ آپ کی بزرگی کا ہر شخص قائل تھا، میر تقی میر اور شیخ علی حزیں جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، آپ کو معزز و مکرم تسلیم کرتے ہیں، جب تک جیے فقیرانہ زندگی بسر کی۔ ۷ محرم ۱۱۹۵ھ کو ایک شخص کے ہاتھ سے زخمی ہوئے اور ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ کو جام شہادت نوش فرمایا۔ سودا نے تاریخ کہی۔

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتد شوم ۔۔۔ اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم

تاریخ از روئے درد یہ سن کے کہی ۔۔۔ سودا نے کہ ہائے جان جاناں مظلوم

۱۱۹۵ ہجری

میر قمر الدین منت نے حدیث نبوی کے الفاظ سے تاریخ نکالی

"عاش حمیداً مات شہیداً" ۱۱۹۵ھ

لوحِ مزار پر خود مرزا مظہر کا یہ شعر کندہ ہے۔

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے	کہ این مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

مرزا مظہر کا کلام اُردو کی تاریخ ارتقار میں ایک خاص درجہ اور اہمیت رکھتا ہے مرزا نے زبان کی صفائی اور سلاست کی طرف خاص توجہ کی، اس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں، دلآویز تشبیہیں اور نئے نئے خیالات پیدا کیے۔ ایہام گوئی کو بالکل ترک کیا۔

کلام میں درد و اثر، سوز و گداز کے ساتھ ساتھ دلی جذبات کا اظہار ہے جس میں عشق حقیقی کے جذبات اور قلبی واردات کی ترجمانی ہے۔

تصانیف میں فارسی کا ایک دیوان اور خریطۂ جواہر فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب ہے۔ اُردو میں ایک ناتمام دیوان ہے جس میں غزلیں اور اشعار ہیں۔

شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، خواجہ احسان اللہ خاں بیاں، مصطفٰے خاں یکرنگ، بساون لال بیدار، ہیبت قلی خاں حسرت محمد فقیہ دردمند صاحب دیوان اور اچھے شاعر ہوئے ہیں۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے	اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر	کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا	لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک	جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے	قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں
آتش کبھو شرارہ کبھو کو لکا کبھو	مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے
یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

شاہ ظہور الدین حاتم

۱۱۱۱ھ ۱۶۹۹ء — ۱۲۰۷ھ ۱۷۹۱ء

شاہ ظہور الدین حاتم شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے، ۱۱۱۱ھ م ۱۶۹۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے "ظہور" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ تعلیم کا صحیح پتہ نہیں، پہلے نواب امیر خاں محمد شاہی کی سرکار میں ملازمت حاصل کی اس کے بعد فقرا کی صحبت میں آزاد منش فقیر ہو گئے۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا پہلے رمز تخلص اختیار کیا اس کے بعد حاتم۔ حاتم سچ مچ ادب کے حاتم ثابت ہوئے۔ ان کے فیض تربیت سے سعادت یار خاں رنگین، مرزا سودا، تاباں، نثار، لالہ مکند رائے فارغ وغیرہ جیسے باکمال شعرا پیدا ہوئے۔ حاتم نے اپنے شاگردوں کی تعداد ۴۵ لکھی ہے، حاتم کو دہلی اسکول کا بانی اور جگت استاد تسلیم کیا گیا، انھوں نے درستی زبان کی طرف خاص توجہ کی یعنی :-

بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیے۔
ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جو اصلاً عربی تھے لیکن تلفظ اور لہجے کے لحاظ سے ہندی ہو گئے۔
حاتم نے تسبیح کو تسبی اور صحیح کو صحی لکھنا جائز سمجھا۔
ہندی کے ثقیل الفاظ اردو میں استعمال کرنے سے گریز کیا۔

اید ھر، کید ھر وغیرہ ترک کر دیا۔

عربی و فارسی کے حروف جو اُردو میں دبتے تھے ان کو بھی نامناسب سمجھ کر ترک کر دیا مثلاً بیگانہ کو بگانہ، دیوانہ کو دوانہ۔ لیکن اس پر کچھ عرصہ تک عمل نہ ہو سکا۔ البتہ ناسخ نے ان پر پوری توجہ کی۔

غرض درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا جو ناسخ وغیرہ، آتش و ذوق کے زمانہ میں پورا ہوا۔

حاتم کے کلام میں روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی ہے۔ صفائی و سادگی سلاست و روانی ہے۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر جگہ زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

میر حسن ان کو "صاحب کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمت" کہتے ہیں، اور میر تقی میر "مرد جاہل و متمکن" کہتے ہیں۔ حاتم کا انتقال ۹۶ برس کی عمر میں رمضان المبارک ۱۲۰۷ھ میں دلی میں ہوا۔

حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا ۔۔۔ محتاجگی سوں مجکو نہیں ایک دم فراغ

کب ملے گا مجھے پیا میرا ۔۔۔ زندگی درد سر ہوئی حاتم

کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا ۔۔۔ ہجر کی زندگی سے موت بھلی

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں

دور ہو پہلو سے، صحبت کے مرے قابل نہیں

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر

سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

اے خردمندو مبارک ہو تمہیں فرزانگی
ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

بے مروت بے وفا بے دید اے بے آشنا
آشناؤں سے نہ کر بے رحمی و بیگانگی

حاتم کے دو دیوان یادگار ہیں ایک قدیم رنگ میں جس میں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش ہے۔

دوسرا جدید رنگ میں۔ آخر عمر میں ضخیم کلیات سے ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا جس کا نام دیوان زادہ رکھا۔

محمد شاہ کے حکم سے ایک مثنوی حقہ پر لکھی یہ مثنوی اس لیئے قابل قدر ہے کہ اس سے پہلے کوئی مسلسل نظم نہیں ملتی۔

ایک دیوان فارسی کا بھی یادگار ہے۔

جائزہ

ولی سے لے کر شاہ حاتم تک۔ اُردو شاعری نے حیرت انگیز ترقی کی، ولی کے بعد اُردو شاعری کا عام رواج ہو گیا اور سیکڑوں شعرا ریختہ گو ہو گئے۔ ولی نے شاعری کا جو قصر تعمیر کیا تھا، ان کے معاصرین اور بعد کے شعراء نے اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ اس کو بلندی و وسعت عطا کی، اس کو حسین و دلکش بنایا، اس سلسلہ میں خان آرزو مرزا مظہر جانجاناں اور شاہ ظہور الدین حاتم کے کارنامے قابل فخر ہیں۔ جنھوں نے زبان کو پاک و صاف کر کے، سلیس و فصیح بنایا۔ اور اس کو یہ صلاحیت و توانائی عطا کی کہ وہ اپنے فطری حسن و سادگی کو برقرار رکھتے ہوئے ہر قسم کے خیالات اور جذبات کو دلکش پیرایہ میں ادا کر سکے، مختصر یہ کہ

بہت سے سخت اور بھدے الفاظ اور محاورات ترک کیے گئے۔

دکنی الفاظ اور بھاشا کے بجائے عربی فارسی الفاظ کو زیادہ جگہ دی گئی۔

خوشنما محاوروں، دلکش ترکیبوں کا استعمال کیا جانے لگا۔

ولی کے بعد شعراء ایہام گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ جس کی وجہ سے سادگی اور بے تکلفی کم ہو گئی۔ مرزا مظہر جانجاناں اور حاتم نے اس کو دور کرنے کی کوشش کی، خصوصاً مرزا مظہر نے ایہام گوئی سے اُردو شاعری کو پاک و صاف کیا۔

جملہ اصناف سخن میں شعراء نے طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل پر سب سے زیادہ توجہ کی گئی۔ اس کے بعد مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ لکھے گئے۔

شاعری میں یوں تو ہر موضوع پر شعراء نے اظہار خیال کیا لیکن حسن و عشق اور تصوف و معرفت پر زیادہ زور دیا گیا۔ مجاز و حقیقت شعراء کا دلچسپ موضوع رہا۔

غزلوں اور مثنویوں میں صوفیانہ خیالات ظاہر کیے گئے۔

متوسّطین شعراء

مرزا محمد رفیع سودا

۱۷۱۳ء — ۱۷۸۱ء

مرزا محمد رفیع سودا دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد مرزا محمد شفیع، تجارت کرنے کی غرض سے ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے۔ سودا کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ نہایت ذہین اور شوخ تھے، طبیعت میں موزونیت بلا کی تھی، بچپن ہی سے عروس سخن کے گیسو سنوارنے لگے تھے، پہلے سلیمان قلی وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے، خان آرزو کے مشورہ سے اُردو میں شعر کہنے لگے۔ کثرت مشق نے بہت جلد استادی کے مرتبہ پر پہونچا دیا، اور علم و ادب کی دنیا ان کی گرویدہ ہوگئی۔ ان کی غزلوں کے اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ ان کے فضل و کمال کی وجہ سے بادشاہ وقت شاہ عالم آفتاب بھی ان سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ دلی میں قتل و غارتگری کی گرم بازاری سے مجبور ہو کر سودا با دل ناخواستہ یہاں سے فرخ آباد چلے گئے، اس کے بعد نواب شجاع الدولہ کے پاس فیض آباد آ گئے۔ نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آ گئے۔ ملک الشعراء کا خطاب، اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ ملا ۱۷۸۱ء میں یہ آفتاب فضل و کمال لکھنؤ میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مصحفی نے تاریخ کہی "سودا کجا و آں سخن دلفریب او" = ۱۱۹۵ھ

سودا اُردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں، شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے

وہ جملہ اصناف سخن پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں، قصائد اور ہجو گوئی میں ان کا ثانی نہیں، مرثیوں میں بھی انھوں نے جدت و ندرت سے کام لے کر کمال حاصل کیا، ان کا کلام نازک خیالات تازہ مضامین، بندش کی چستی الفاظ و تراکیب کی ندرت تشبیہات و استعارات کی جدت، سلاست و روانی، فصاحت و بلاغت، کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی خدمات اور اصلاحات نے اردو زبان و ادب کو ترقی و بقا، وسعت و رفعت، گہرائی و گیرائی عطا کی۔ مختصراً ان کے کلام میں حسب ذیل خصوصیات ہیں:-

۱۔ زبان پر قدرت کاملہ سودا الفاظ کے شہنشاہ ہیں، انھوں نے زبان کی اصلاح کی، ہندی الفاظ کی درشتی دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔

۲۔ زبان کو ادبی حیثیت عطا کی اور اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا اور اس سنگریزہ کو درِ عدن بنایا۔

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا ۔۔۔ پسندِ خاطرِ دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کر اس کو گوش کرے تھا جہاں ہر اہلِ کمال ۔۔۔ یہ سنگریزہ ہوا ہے درِ عدن مجھ سے

۳۔ نئی نئی ترکیبیں وضع کیں اور فارسی کی روش پر ایجاد کیے۔

۴۔ فارسی روایات اور تلمیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات اور الفاظ کا استعمال بھی کیا مثلاً جھجل ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ پربت، رائی وغیرہ۔

۵۔ ہندی علم الاصنام میں ارجن کی بہادری، کنھیا کا عشق، وغیرہ ان کے کلام میں موجود ہے۔

۶۔ قدیم ایہام گوئی اور دوہروں کے رواج کو ترک کیا۔

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی ۔۔۔ منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

۷۔ پیرایۂ بیان پرشکوہ شاندار اور باوقار ہے۔
۸۔ تخئیل کی بلندی و نزاکت، فکر کی نکتہ آفرینی و جدت میں سودا منفرد ہیں۔ مضامین ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔

کہتا ہی جامہ کہ کس کس کو میں باندھوں — بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

۹۔ خیالات بلند اور پرعظمت ہیں، طبیعت میں شگفتگی اور ظرافت غضب کی ہے، اس میدان میں وہ عرفی و ظہوری اور خاقانی و انوری سے بھی آگے ہیں۔
۱۰۔ مرزا سودا کو موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا، ان کے کلام میں موسیقیت و موزونیت بلا کی ہے۔ ہر شعر سانچہ میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
۱۱۔ مرزا سودا نہایت زود گو، پرگو اور خوشگو تھے، اس خوبی کے باوجود وہ "سر آمد شعرائے فصاحت" تسلیم کیے گئے۔ شاہ حاتم ان کو "پہلوان سخن" کہتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ مرزا کو غزل گوئی میں وہ مقبولیت اور شہرت نصیب نہیں ہوئی جو میر کو ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی غزلیں بھی سوز و گداز اور درد واثر سے خالی نہیں ہیں۔

بیکس کوئی مرے تو جلے اس پہ دل مرا — گویا یہ ہے چراغ غریبوں کے گور کا
رخصت ہو باغباں کہ ذرا دیکھ لیں چمن — جاتے ہیں اس جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا
ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ — دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا
کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں
ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں — اے الفت چمن ترا خانہ خراب ہو

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں — اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے
جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے
گل پھینکے ہیں غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
اثر ہے آہ میں ہر چند نے تاثیر نالے میں — پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا جی بہلتا ہے

فارسی اور اُردو دونوں میں سوداؔ کی متعدد تصانیف ہیں۔ اُردو کلیات بہت ضخیم ہے جس میں قصائد، غزلیات، مثنویات، رباعیات، قطعات، سلام، مرثیے، واسوخت، مسدس، مستزاد اور ترجیع بند وغیرہ جملہ اصناف سخن موجود ہیں، لیکن ان کے قصائد ہر صنف سے آگے ہیں۔ مختصر طور پر قصائد کی حسب ذیل خصوصیات ہیں :-

۱۔ قصائد میں متانت، پختگی، زور الفاظ، مضمون آفرینی، علو تخیل سب سے زیادہ ہے۔
۲۔ استعاروں اور تشبیہوں کے استعمال میں جدت و ندرت سے کام لیتے ہیں۔
۳۔ سوداؔ کے قصائد محاکاتی شاعری کا بہترین مرقع ہیں۔
۴۔ مدح اور ہجو کے علاوہ تاریخی واقعات اور سماجی حالات بھی پائے جاتے ہیں۔
۵۔ قصائد میں بہاریہ تمہید کے بجائے نئے نئے عنوان پیش کئے ہیں۔

خواجہ میر دردؔ

۱۷۲۱ء — ۱۷۸۵ء
۱۱۳۳ھ

خواجہ میر دردؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب خدا رسیدہ بزرگ اور فارسی کے بہترین شاعر تھے، دردؔ نے انھیں کے آغوش تربیت

میں پرورش پائی، درویشانہ تعلیم نے روحانیت کو جلادی، تصوف کے رنگ میں ڈوب گئے۔ والد کے انتقال کے بعد بائیس برس کی عمر میں فقر و تصوف کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ تصوف اور شاعری، صبر و توکل، استغنار و تقدس کو ورثہ میں پایا۔ ذاتی تقدس، خودداری اور عبادت، ریاضت کی وجہ سے امیر غریب بادشاہ فقیر، ہندو مسلمان سب ان کی عزت کرتے تھے۔ علائق دنیا سے بالکل الگ رہے، سلطنت کی تباہی اور مرہٹوں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے دلی میں امن و امان غارت ہو گیا تھا، معاشرتی و معاشی الجھنیں بڑھ گئی تھیں۔ بڑے بڑے اہل کمال تنگ آکر دلی سے لکھنؤ چلے گئے، لیکن درد کے پائے استقلال کو جنبش نہیں ہوئی وہ اللہ پر بھروسا کئے اپنے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھے رہے، یہاں تک کہ ۱۱۹۹ھ میں واصل بحق ہوئے۔ تاریخ وفات یہ ہے

"حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب" ہے

بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ یہ شوق آخر وقت تک قائم رہا متعدد تصانیف لکھیں جو فارسی میں ہیں اور جن کا موضوع مذہب و تصوف ہے، متعدد علوم و فنون میں طاق تھے، تصوف اور موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ نظم میں ایک دیوان فارسی اور ایک دیوان اُردو کا یادگار ہے۔

خواجہ دردؔ کا کلام صفائی و پاکیزگی، سلاست و روانی، درد و اثر کا بہترین مرقع ہے۔ معرفت حقیقی، وحدت الوجود اور تصوف کے مختلف مسائل ان کی شاعری کے اہم موضوع ہیں۔ ان کی زبان نہایت شیریں اور سلیس ہے۔

انداز زبان متین اور سنجیدہ ہے۔ غزلیں صاف ستھری، رطب و یابس سے پاک مختصر، سادہ، شگفتہ اور مترنم ہوتی ہیں۔ بقول آزادؔ " خواجہ میر دردؔ صاحب کی

غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے "

خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوتی "

شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، درد اور کسک، سوز و گداز میں ان کی غزلیں میرؔ کے برابر ہیں۔ عشق حقیقی کا جلوہ ہر شعر میں نمایاں ہے۔

حجابِ رُخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو
ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

میر حسن

سنہ ۱۷۳۶ء — سنہ ۱۷۸۶ء

میر غلام حسن، حسنؔ، میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے ذوق شاعری ورثہ میں پایا۔ پہلے اپنے والد کے پھر خواجہ میر دردؔ کے شاگرد ہوئے

میر ضیاءؔ سے بھی استفادہ کیا۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے جب لکھنؤ دارالسلطنت ہوگیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں بعمر پچاس سال انتقال کیا۔ مصحفی نے "شاعرِ شیریں بیاں" تاریخ وفات کہی۔

میر حسن فطرۃً نہایت خوش مزاج، ہشاش بشاش، ظریف اور بزلہ سنج شیریں زبان، خلیق، متواضع اور قابل انسان تھے۔ میر حسن نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، غزل، رباعی، مثنوی، مرثیہ سب خوب کہتے تھے۔ مثنوی میں اتنا کمال حاصل کیا کہ زندہ جاوید ہوگئے۔ سحر البیان معروف بہ مثنوی میر حسن اُردو میں لاجواب اور شاہکار ہے۔ غزلوں میں میر تقی میرؔ اور سوزؔ کا رنگ ہے۔ ان میں سادگی، جوش، روانی اور آمد ہے۔

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ	بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
جان و دل ہیں اُداس سے میرے	اُٹھ گیا کون پاس سے میرے
اس بت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسنؔ	یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

لیکن ان کا نام سحر البیان کی وجہ سے زندہ ہے۔ یہ مثنوی زبان و بیان کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ اس میں جذبات نگاری، منظر نگاری اور مرقع کشی، ماحول کی مطابقت، تسلسل بیان، محاکات، سیرت نگاری، تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال، روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سب کچھ موجود ہے۔ مثنوی کے کردار صرف خیالی اور غیر فطری نہیں ہیں بلکہ ان میں انسانی خصائل بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ مثنوی سماجی اور تاریخی حالات کی آئینہ دار بھی ہے۔ مثلاً شریف زادوں کی وضع بعہد نواب آصف الدولہ۔

گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک	بدن سے عیاں نورِ عالم کا ایک

تمامی کی سنجاب جلوہ کناں ۔ کہ جوں عکس مہ زیر آب رواں
طرحدار اک سر پہ بیٹھا ہوا ۔ ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
وہ موتی کی لٹکن زمرد کی لڑ ۔ لٹک جس کی زیبندہ دستار پر
اگر مہ زلف کی اور کاکل کا بل ۔ جوانی کی شب اور سماں بر محل

مثنوی سحر البیان کے علاوہ دس مثنویاں اور ہیں جس میں گلزار ارم مشہور ہے۔ ایک دیوان جس میں جملہ اصناف سخن ہیں۔ ایک تذکرہ، تذکرۃ الشعرا، جس میں تین سو شعرا کا ذکر ہے، یادگار ہیں۔

مرزا جعفر علی حسرت

متوفی سنہ ۱۲۰۶ھ

مرزا جعفر علی حسرت ابوالخیر عطار کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے۔ شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی، رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔

ابتدا میں رؤسا اور شاہزادوں کی مصاحبت و ملازمت میں رہے ۱۱۹۵ھ میں لکھنؤ آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ ایک صاحب دل درویش کی نظر نے تارک الدنیا بنا دیا۔ سنہ ۱۲۰۶ھ میں انتقال کیا۔ جرأت نے تاریخ کہی۔ یوں مرا جہاں سے حسرت کی پوری زندگی شعر و شاعری میں گزری۔ انھوں نے بڑے بڑے باکمال شاگرد پیدا کیے۔ شیخ قلندر بخش جرأت، نواب محبت خاں محبت۔ خواجہ حسن انھیں کے شاگرد تھے۔

حسرت کے کلام میں ناہمواری ضرور پائی جاتی ہے لیکن نشست الفاظ اور حسنِ ترکیب میں وہ دوسرے اساتذہ سے پیچھے نہیں ہیں۔ خیالات کی سادگی

حسرت افسوس (۱۲۰۰ھ)

اور جذبات کی ترجمانی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کی اکثر غزلیں ایک ہی مضمون پر قطعہ کی صورت میں ہیں۔

کلیاتِ حسرتؔ میں جملہ اصناف، ساقی نامہ، مثنوی، داسوخت، ترجیع بند ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں اور غزلیں موجود ہیں، غزلیں سب سے زیادہ ہیں، کلیات ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہی اتنا کہ گلشن میں ۔۔۔ گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

آشیاں چھوڑ چلے اے چمن آرا ہم تو ۔۔۔ تو ہی اے جائیو سر پر یہ گلستان اٹھا

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے ۔۔۔ لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے اپنی شکل دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو اسی طرح سے جگا گئے

قائمؔ چاندپوری

متوفی سنہ ۱۲۰۸ھ

شیخ قیام الدین قائمؔ چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، دلی میں بسلسلۂ ملازمت قیام رہا۔ وہیں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، پہلے خواجہ میر دردؔ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے اصلاح لیتے رہے اس کے بعد مرزا رفیع سوداؔ کے شاگرد ہو گئے اور ایسی مشق بہم پہونچائی کہ استاد کے لئے باعث فخر ہو گئے۔

دلی اُجڑی تو یہ بھی وہاں سے رخصت ہوئے، کچھ دنوں نواب محمد یار خاں کے

پاس ٹانڈہ میں گزارے اس کے بعد رام پور چلے آئے، تنگدستی وہاں بھی ساتھ رہی مجبوراً لکھنؤ آئے، مہاراجہ ٹکیت رائے کی بدولت جائیداد بحال ہو گئی۔ رامپور میں ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی، جرأت نے تاریخ کہی۔ قائم بنیاد شعر ہندی تھا ہے کیا کہئے آہ۔

قائم، خوش مزاج، متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، خوش مقال تھے، ان کا مرتبہ شاعری میں بہت بلند ہے۔ مرزا علی لطف مصنفہ تذکرہ گلشن ہند نے میر و سودا کے بعد سب سے زیادہ انھیں کو پسند کیا ہے، مولانا آزاد نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ فن شعر میں کامل تھے ان کا دیوان میر و مرزا سے پیچھے نہیں رکھ سکتے۔

صاحب طرز و نازک خیال اور معنی آفریں شاعر تھے۔ خود کہتے ہیں۔

آج قائم کے شعر ہم نے سنے	ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

سوز و گداز میں میر ثانی، تغزل میں سودا سے بہتر تھے۔ غزل کے علاوہ قطعات و رباعیات میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ قائم نے اردو شعراء کا ایک تذکرہ "مخزن نکات" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند	دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا
درد دل کچھ کہا نہیں جاتا	آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم	کیا کروں پر رہا نہیں جاتا
آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی	سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں
جور سپہر، دوری یاران و درد ہے غیر	جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں
ہم سے ملے نہ آپ تو ہم بھی نہ مر گئے	کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے
مر جائیے کسی سے پر الفت نہ کیجئے	جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

سیّد محمد میر سوزؔ

سنہ ۱۷۲۰ء - سنہ ۱۸۹۹ء

سید محمد میر سوزؔ، میر ضیاء الدین کے بیٹے تھے، سنہ ۱۷۲۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، اور اسی کی آغوش میں پروان چڑھے۔ علمی استعداد کافی تھی، خوشنویسی میں استاد تھے۔ سپہ گری، تیر اندازی اور شہسواری کے فن میں ماہر تھے۔ شعر و شاعری کا شوق فطری تھا، پہلے میرؔ تخلص اختیار کیا لیکن میر تقی میرؔ کے مقابلہ میں مشہور و مقبول نہ ہو سکا۔ اس لیے سوزؔ رکھ لیا۔ اس شعر میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کہتے تھے پہلے میرؔ میرؔ تب نہ ہوئے ہزار حیف ۔۔۔ اب جو کہے ہیں سوزؔ سوزؔ یعنی سدا جلا کرو

دلی کی تباہی اور زبوں حالی نے انھیں بھی خانہ بدوش کر دیا، پہلے فرخ آباد گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے، مگر رنگ جمتا نہ دیکھ کر مرشد آباد گئے، وہاں بھی قسمت نے ساتھ نہ دیا، پھر لکھنؤ واپس آئے۔۔ نواب آصف الدولہ نے قدر دانی کی اور ان کے شاگرد ہو گئے، چند روز بھی آرام سے نہ گزرے تھے کہ موت کا پیغام آ پہونچا۔

سنہ ۱۷۹۹ء میں انتقال کیا۔ جرأتؔ نے کہا "داغ اب سوز کا لگا دل کو" سنہ ۱۲۱۳ھ

میر سوزؔ کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے اگرچہ وہ میرؔ و سوداؔ کے ہم پلہ نہیں لیکن حسب ذیل خصوصیات کی بنا پر وہ غزل گوئی میں استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔

۱۔ زبان شیریں، نرم، نازک، لطیف اور پاکیزہ ہے، اور غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔

۲۔ لفظی صنائع بدائع، تکلف اور آورد سے پاک و صاف ہے۔

۳۔ روزمرہ و محاورہ کی چاشنی و بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

۴۔ فضول مبالغے، تشبیہیں اور استعارے نہیں ہیں۔
۵۔ فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے بجائے سیدھے سادے ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔
۶۔ انداز بیان نہایت صاف اور پُر اثر ہے۔
۷۔ پورا کلام آمد ہی آمد ہے۔ آورد یا تصنع کا نام و نشان نہیں۔
۸۔ سادگی و بے ساختگی، سوز و گداز، سوز کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔
۹۔ اشعار کے جملے لطیف و نازک، سبک و رواں ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات چیت کر رہے ہیں۔

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا
اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج

زندگی میں جفا غنیمت ہے
سوزؔ یہ ظلم بار بار کہاں

سرزد تو یہ ہو اُس سے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

سوزؔ صاحب دیوان تھے۔

اور تو اور کہہ گئے دو باتیں
سوزؔ کہلایا صاحب دیواں

میر تقی میر

۱۷۲۴ء ۔ ۱۸۱۰ء

خدائے سخن، میر تقی میر، میر عبداللہ عرف علی متقی کے صاحبزادے اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ میر عبداللہ صوفی منش اور درویش صفت، عشق حقیقی کی لذت سے آشنا بزرگ تھے۔ اپنے بیٹے کو بھی علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی علوم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور وہ دس برس کی عمر میں ہی بیٹے کو داغ یتیمی دے گئے۔ میر صاحب کے بڑے بھائی نے باپ کے متروکہ پر قبضہ کرلیا، اور بڑی بے مروتی کی۔ میر دل گرفتہ ہو کر دلی پہونچے، عمر ہی کیا تھی پیٹ پالنے اور سر چھپانے کے لئے در در کی خاک چھانی، کہیں بھی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ نامرادانہ زیست بسر کرنے اور تمام عمر محرومیوں و ناکامیوں سے کام لینے کی ابتدا ابھی سے ہو گئی۔

دلی میں خان آرزو، میر صاحب کے عزیز قریب تھے، کچھ دن وہاں رہے لیکن خان آرزو کی شفقتوں سے عاجز آکر اکبرآباد چلے آئے۔ یہاں کون تھا جو اس پریشان حال یتیم کی مدد کرتا، چند دنوں کے بعد دلی کا رُخ کیا اور وہیں رہنے لگے۔ دلی میں جب طوائف الملوکی اور افراتفری کا دور دورہ ہوا تو بڑے بڑے صاحب کمال اپنی عزت و آبرو اور جان بچا بچا کر بھاگے۔ لکھنؤ نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ میر صاحب کو بھی نواب آصف الدولہ نے عزت و احترام کے ساتھ بلایا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔ میر صاحب کی بقیہ عمر نسبتاً فراغت سے بسر ہوئی لیکن دل گرفتگی دم کے ساتھ رہی۔ ۱۸۱۰ء کو اقلیم سخن کا یہ عرماں نصیب شہنشاہ

لکھنؤ کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ شیخ ناسخ نے تاریخ وفات کہی۔
"واویلا مُرد شہ شاعراں"

میر صاحب فطرۃً خاموش طبع اور نازک مزاج تھے۔ حالات اور ستم ہائے روزگار نے انھیں حسرت و افسوس اور درد و غم کا پیکر بنا دیا تھا، نازک مزاجی تنگ مزاجی کی حد تک پہونچ گئی تھی، وہ بیحد خوددار اور غیور تھے۔ غربت و انلاس میں یہ صفت مغرور اور بد دماغ مشہور کر دیتی ہے۔ میر صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ — دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ — ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
ازبسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

عشق کی ستم انگیزی، یاس و حرماں کی موجزنی، بے ثباتی دنیا، فقر و قناعت کی تلقین میر کی شاعری کے اربعہ عناصر ہیں۔ میر کا کلام ان کے قلبی واردات اور درد و غم کی ہو بہو تصویر ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

کلام میر کی خصوصیات کے لئے دفتر چاہیئے، مختصر یہ کہ الفاظ کا صحیح استعمال فصاحت و سادگی، مضامین کی جدت اور تاثیر خستگی، نشتریت، ملاحت، خالص تغزل، زبان کی باوقار شیرینی، آہنگ کی خوشگوار نرمی، پرخلوص جذبات و احساسات، نازک مزاجی، خودداری، آلام عشق، غم روزگار، رنج و الم کی فراوانی، سوز و گداز درد و اثر، ذاتی تجربات و محسوسات، انفرادیت، اجتماعیت کا اشتراک، ان کے کلام کی روح ہیں۔

میر صاحب کی فطری مناسبت و موزونیت اور دردمندی و غمگینی نے ان کو

بے مثل و بے نظیر غزل گو بنا دیا، سب نے ان کو خدائے سخن تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے ریختہ کو رتبہ پر پہونچا دیا۔

ریختہ رتبہ کو پہنچا یا ہوا اس کا ہے — معتقد کون نہیں میرؔ کی استادی کا

سارے عالم پر ہی ہوں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

جملہ اساتذہ اور ناسخؔ، غالبؔ، ذوقؔ جیسے باکمالوں نے میرؔ کی تقلید اور پیروی کرکے "معتقدِ میرؔ" ہونے پر فخر کیا ہے۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

نہ ہوا پر نہ ہوا ذوقؔ کا انداز نصیب — ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر صاحب کی مثنویاں بھی سوز و گداز اور واردات عشق کا پیکر ہیں، ان میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، واسوخت انھیں کی ایجاد ہے۔ غرض شاعری میر صاحب کی زندگی تھی۔ ان کا احسان اُردو زبان پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ ان کے کلام کا عالمگیر و دلکش حسن کسی مقام اور وقت کے لئے مخصوص نہیں اس کا لطف و اثر کسی زمانے میں بھی کم نہیں ہو گا۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز — تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

ان کا یہ فرمانا سچ ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میر صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہے:۔

اُردو۔ چھ دواوین۔ جو غزلیات پر مشتمل ہیں۔

متعدد مثنویاں۔ اجگر نامہ، شعلۂ عشق، جوشِ عشق، دریائے عشق، اعجازِ عشق، خواب و خیال، معاملاتِ عشق، تنبیہ الجہال، شکار نامہ وغیرہ

مشہور رہیں۔

فارسی میں ایک دیوان ہے۔ ذکر میر میں خود نوشت حالات، فیضِ میر، اور تذکرہ نکات الشعرا (اردو شعراء کا تذکرہ) ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا　　آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں　　دل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب

پھول، گل، شمس و قمر سارے ہی تھے　　پر ہمیں ان میں تمہیں بھائے بہت

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز　　آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں　　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر　　بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں

غم و اندوہ، بیتابی، الم، بے طاقتی، حرماں　　کہوں اے ہمنشیں تا چند غم ہائے فراواں کو

اب کے بہت ہے شورِ بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو

دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم　　کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پر میں کیا کروں　　منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

جُرأت

متوفی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء

شیخ قلندر بخش جرأت، حافظ امان کے بیٹے اور جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے، دہلی کے رہنے والے تھے، فیض آباد میں پروان چڑھے ۔ ۱۸۰۰ء میں لکھنؤ آ گئے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ شیخ ناسخ نے تاریخ کہی "ہائے ہندوستان کا شاعر موا"۔

جرأت فن شاعری کے علاوہ نجوم اور موسیقی میں بھی ماہر تھے، ستار خوب بجاتے تھے، طبیعت بلا کی پائی تھی۔ شاعری کا ملکہ فطری تھا۔ میر حسن نے ان کو "فن شعر کا دیوانہ" کہا ہے۔ افسوس ہے کہ جوانی ہی میں بینائی سے محروم ہو گئے۔

جرأت اپنے رنگ کے باکمال شاعر ہیں۔ ان کی زبان صاف سادہ اور پاکیزہ ہے، انداز بیان دلکش ہے، سوز و نغمہ و موسیقیت ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ معاملہ بندی ان کا خاص رنگ ہے۔ غزل میں انھیں انفرادیت حاصل ہے، اظہار محبت میں وہ کہیں کہیں بیباک اور گستاخ ہو جاتے ہیں، خیالات میں رنگینی ہے، حسن و عشق کے معاملات اور واردات کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں، روزمرہ اور محاورہ کا لطف ہر جگہ موجود ہے۔

انھوں نے اپنی یادگار میں ایک ضخیم کلیات چھوڑا جو مختلف اصناف سخن کا مجموعہ ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں، مستزاد، ترجیع بند، رباعیاں، واسوخت، مخمس، مسدس، مرثیے اور سلام سب کچھ موجود ہے۔

آئے جو مرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے
یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

فصلِ گل گرچہ ہزار آئی پر اپنا جرأت
دل پژمردہ نہ جوں غنچۂ تصویر کھلا

سنتا ہے کون کس سے کہوں درد بے کسی
ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہمنشیں نہیں

ہم اسیروں کو ملا ہے تنگ یاں ایسا قفس
زیرِ گردوں ٹک نہیں پر تلملا سکتے نہیں

کیا کہوں جرأت میں اس صیاد قاتل کا گلہ
دام سے چھوڑا تو چھوڑا توڑ کر بازو مجھے

سید انشاء اللہ خاں انشاء

متوفی ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء

سید انشاء اللہ خاں انشاء مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر ماشاء اللہ خاں تھا۔ تعلیم و تربیت اعلےٰ پیمانہ پر ہوئی۔ نہایت ذہین اور طباع تھے، بہت جلد مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کر لیا۔ آغاز شباب میں دہلی آ گئے اور شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے لیکن طبیعت کو سیری نہ ہوئی۔ دلی سے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ یہاں شاہ عالم کے فرزند مرزا سلیمان شکوہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور یہاں تک عزت اور قدردانی کی کہ اپنا استاد بنا لیا۔ مگر انشاء یہاں بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی ہو گئی۔

اپنی قابلیت، شگفتگی مزاج، زورِ طبیعت، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی بدولت انشاء نے نواب کو ایسا گرویدہ بنا لیا کہ ان کو انشاء کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ لیکن "ہر کمالے را زوالے" نواب کسی بات پر انشاء سے اتنے زیادہ کبیدہ خاطر ہو گئے کہ تنخواہ وغیرہ سب بند کر دی، فقر و فاقہ کی نوبت آ گئی آخر اسی بے کسی اور بے چارگی کے عالم میں فرسشتہ موت نے ۱۲۳۳ھ میں انشاء کو تمام تکلیفوں سے

نجات دلادی۔ بسنت سنگھ نشاطؔ نے صنعت تعمیہ میں تاریخ وفات کہی۔

سالِ تاریخ او زجانِ اجل عرفی وقت بود انشاؔ گفت
۲
+ ۳۰ ۱۲ھ = ۱۲۳۳ھ

انشاؔ بچپن ہی سے اپنی ذہانت، لطافت شوخی، حاضر جوابی کے لیے مشہور تھے، طبیعت کی موزونی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ علمی قابلیت نے چار چاند لگائے، عربی و فارسی کے زبردست فاضل تھے۔ ہندی، پنجابی، مرہٹی، پوربی، کشمیری، ترکی اور پشتو زبانیں خوب جانتے تھے اور ان سب میں شعر کہتے تھے۔ اپنی اختراع پسند طبیعت، بلند تخئیل، اعلیٰ قابلیت اور اپنے زورِ کلام کی بدولت وہ اُردو شعراء میں منفرد و ممتاز ہیں۔ ان کی ہمہ دانی، حاضر جوابی اور شگفتگی مزاج کا جواب نہیں، سوداؔ کی طرح وہ بھی فارسی، عربی کے علاوہ ہندی کے رسیا تھے۔ ہندی کے نرم اور لطیف، سلیس اور آسان الفاظ ان کے کلام میں بکثرت ہیں۔ انھوں نے بحور اور اصناف شاعری کا نام بھی ہندی میں رکھا۔ مثلاً مثلث کا نام تکڑا، مربع کا نام چوکڑا۔ بحروں میں مفاعیلن کو چری خانم اور فاعلن کو چت لگن سے بدلا۔ منطق کی اصطلاحیں بھی ہندی میں لکھیں۔

انشاؔ کے کلیات میں جملہ اصنافِ سخن، قصیدے، غزلیں، قطعے، منظوم خطوط رباعیاں، پہیلیاں، چیستانیں، ہجویں اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں موجود ہیں۔ ان کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ ان کا کلام اپنے ماحول کا ترجمان ہے۔ ان کے یہاں جو رنگینی، شوخی، ظرافت، ہجو اور عریانی پائی جاتی ہے وہ اُس زمانہ کا عام مذاق تھا۔ غزلوں میں داخلی پہلو نہ ہونے کے برابر ہے، وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے لیے پیدا ہوئے تھے، درد و غم سے ان کو کیا کام، ظرافت، تمسخر

اور پھکڑپن کی حد تک پہونچ گئی۔ رنگینیٔ مزاج اور شوخیٔ طبیعت نے عورتوں کی زبان اور ان کا لب و لہجہ اختیار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ریختی کے موجد بنے۔ آخر عمر کے حادثات و انقلابات نے کلام میں درد و اثر پیدا کر دیا۔

انشاؔ نے نثر بھی لکھی انھوں نے سب سے پہلے قواعد کی کتاب دریائے لطافت ۱۸۰۸ء میں لکھی۔ رانی کیتکی کی کہانی خالص اُردو میں ان کی یادگار ہے، اس کہانی میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

نزاکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشاؔ
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

چند مدت سے فراقِ صنم و دیر تو ہے
چلو پھر کعبہ ہی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اس کی ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

غصے میں ترے ہم نے بڑا لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

شیخ غلام علی راسخ

۱۱۶۲ھ — ۱۲۳۸ھ
۱۷۴۹ء — ۱۸۲۲ء

شیخ غلام علی راسخ ۱۷۴۹ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ شعر و سخن کا ملکہ خداداد تھا، میر تقی میرؔ سے استفادہ سخن کیا۔

فطری مناسبت اور میرؔ جیسے باکمال استاد کی شاگردی کی بدولت راسخ بہت جلد

استادی کے مرتبہ پر فائز ہوگئے اور انھوں نے عظیم آباد (پٹنہ) میں ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جس میں لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ راسخ ١٢٢١ھ/١٨٠٦ء تک مختلف مقامات کی سیر و سیاحت میں مصروف رہے، لکھنؤ میں زیادہ قیام رہا۔ ١٢٢٢ھ/١٨٠٧ء میں اپنے وطن واپس آ رہے اور بقیہ عمر شعر و ادب کی خدمت کرنے میں بسر کی۔ ١٢٣٨ھ/١٨٢٢ء میں مادرِ وطن کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

راسخ نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ کلیات میں قصیدے، غزلیں، اور مثنویاں زیادہ ہیں۔ ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی بیان کی سادگی پائی جاتی ہے، تصوف کی چاشنی ہر جگہ موجود ہے۔ تشبیہ و استعارے کم ہیں۔ کلام میں رطب و یابس نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو کچھ ہے انتخاب ہے۔ تغزل کا رنگ قصائد اور مثنویوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل
اس قید مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر
تاسد نے ان کے آنے کی دل سے بنائی بات

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا
لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنس وفا ہم

اٹھا سکتے نہیں بے طاقتی کا بار بھی اب ہم
ہوئے ہیں ناتواں ایسے کہ جینا تک بھی بھاری ہے

اگر بابِ اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی
تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے

سعادت یار خاں رنگین

۱۱۷۰ھ - ۱۲۵۱ھ
۱۷۵۷ء - ۱۸۳۵ء

سعادت یار خاں رنگین، مرزا طہماسپ بیگ خاں کے بیٹے تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے، دلی میں پروان چڑھے۔ فنون سپہ گری کے ماہر اور شعر گوئی کے استاد تھے۔ شاہزادوں کی مصاحبت، ملازمت اور تجارت ان کا مشغلہ تھا۔ لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں عرصہ تک ملازم رہے، آخر عمر میں تجارت و ملازمت سے سبکدوش ہوکر دلی چلے آئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۱۲۵۱ھ میں وہیں انتقال کیا۔ غمگین نے تاریخ وفات کہی۔

"کہ ساتھ ان کے غمگیں" گئی ریختی"

شعر و سخن کا شوق فطری تھا۔ شاہ حاتم سے مشق سخن کی اور چند دنوں میں ہی استادی کے مرتبہ پر پہونچ گئے۔ طبیعت میں شوخی، بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ ایجاد و اختراع کا مادہ کافی تھا۔ زبان میں نزاکت و رنگینی اس درجہ کی تھی کہ ریختہ سے ریختی کی ایجاد کی جس کو سید انشا نے خوب چمکایا اور لکھنؤ میں یہ رنگ خوب مقبول ہوا۔ رنگین کی تصانیف کی تعداد پچیس تک معلوم ہو سکی ہے۔ ان کا ایک مجموعہ نورتن بھی ہے جس میں چار دیوان اردو کے ہیں، ان کے علاوہ پانچ اور کتابیں ہیں، ایجاد رنگین، فرس نامہ، رنگین نامہ، مجالس رنگین، مثنوی دلپذیر۔ تصانیف کے اعتبار سے رنگین اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر، زباندان اور عالم تھے۔ ہزلیات اور ریختی کو چھوڑ کر زبان کی پاکیزگی و صفائی، خیال کی وسعت و ہمہ گیری، جذبات کی صداقت

دو رنگینی رنگینؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔

جو نالہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا — تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا

دل تھا جو بساط اپنی سو گزران چکے ہیں — جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی — کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

وہ نہ آوے تو تو ہی چل رنگینؔ — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

دمبدم بسکہ ترا حسن فزوں ہے ظالم — روز جی میں ہے کہ کھینچوا اپنے تصویر نئی

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

سنہ ۱۱۶۴ھ ——— سنہ ۱۲۴۰ھ
۱۷۵۱ء ——— ۱۸۲۴ء

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، شیخ ولی محمد کے بیٹے، امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، درسیات کی تکمیل دلی میں کی۔ شعر و شاعری کا ملکہ فطری تھا، چند ہی روز میں مشہور ہو گئے۔ اپنے گھر پر بزم مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ جس میں جملہ شعرا اور دلی کے معزز اشخاص شریک ہوتے تھے۔ دلی کی تباہی پر وہاں سے نکلے مگر دلی کی یاد مرتے مرتے دل سے نہ نکلی۔

دلی کہیں ہیں جس کو زمانہ میں مصحفیؔ — میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

دلی سے نکل کر نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ میں کچھ دنوں تک عزت و احترام کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ آ کر دلی واپس ہو گئے، لیکن آب و دانہ پھر لکھنؤ لے آیا۔ اس مرتبہ شہزادہ سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ چند ہی دنوں میں ان کی استادی کو خاص و عام نے تسلیم کر لیا۔ جب سید انشا، شہزادہ کے دربار

سے وابستہ ہوئے تو مصحفی کی قدر کم ہونا شروع ہوئی، آخر عمر افلاس و تنگدستی میں گزری۔ چھہتر برس کی عمر میں یہ آفتاب شاعری سنہ ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء میں غروب ہو گیا۔

مصحفی کے صاحب کمال ہونے میں شبہہ نہیں۔ نہایت زود گو اور پُر گو تھے طبیعت میں موزونیت و ہمہ گیری تھی۔ مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر قدرت کاملہ تھی اور نثر و نظم دونوں میں استاد تھے۔ عربی کی غزلیں اور نعتیہ قصائد، فارسی میں چار دیوان اور ایک نامکمل شاہنامہ یادگار ہیں۔

اُردو میں جملہ اصناف سخن پر مشتمل آٹھ ضخیم دیوان موجود ہیں، جن کا مختصر سے مختصر انتخاب بھی بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔

نثر میں تین تذکرے عقد ثریا، فارسی شعراء کا تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحا اُردو شاعروں کے لکھے۔ فارسی محاوروں پر مفید الشعرا اور عروض پر خلاصۃ العروض لکھی۔

مصحفی کی امتیازی خصوصیت "نشاطِ شباب" اور "رنگ و روپ" کو نہایت پرکیف اور رنگین طریقہ سے بیان کر دیتا ہے، ان کے یہاں دہلوی اور لکھنوی رنگ کا حسین امتزاج ہے، میر، سودا اور سوز تینوں کا رنگ موجود ہے۔ قواعد فن کی پابندی کی وجہ سے کلام عیوب سے پاک ہے، اصلاح زبان کی طرف خاص توجہ کی اور بہت سے الفاظ متروک قرار دیے۔ نیز مقامی الفاظ رائج کئے، ان کی شاعری میں ملکی خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ لکھنوی زبان کی بنیاد مصحفی ہی نے ڈالی۔ داخلیت اور خارجیت کو سمو کر حسین اور لطیف انداز میں پیش کرنے کے لئے جو مخصوص زبان اور لہجہ استعمال کیا۔ اسی کی داغ بیل پر آتش و ناسخ نے لکھنوی زبان کا سنگ بنیاد رکھا۔ مصحفی کی غزلوں میں آہنگ کی انفرادیت، لب و لہجہ کی نرمی، زبان کی شیرینیا

دغنائیت، بیان کی دلکشی، خیال کی ہمہ گیری، حسن وعشق کے معاملات کی ترجمانی، سوز وگداز اور قصائد میں شاندار الفاظ، دل پسند ترکیبیں، مشکل زمینیں، خیال میں رفعت غرض سب کچھ موجود ہے۔ البتہ جوش وخروش میں سودا ان سے آگے ہیں، مثنویوں میں بھی وہ کسی سے کم نہیں ہیں، ایک مثنوی بحر المحبت بہت مشہور ہے۔ جملہ اساتذہ نے مصحفی کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

شوخی تو دیکھو تیر کو سینہ سے کھینچ کر کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا

کنج قفس میں لطف ملا جب کو وہ اسیر چھوٹا بھی گر تو پھر نہ سوئے آشیاں گیا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

ظالم دیار دل کا تجھے پاس ہے ضرور ویراں ہوا یہ گھر تو بسایا نہ جائے گا

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

او دامن اٹھا کے جانے والے ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھا لے

کبھی تک کو در کے کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے

ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

حسرت پہ اس مسافر بیکس کے روئیے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

غم دل کا بیان چھوڑ گئے ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے

راہ میں کشتے پڑے ہیں کئی ارمان بھرے

نکلے چلیو نہ ترا خون سے دامان بھرے

سید محمد میر اثر

سید محمد میر اثرؔ، خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ کے بیٹے اور خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بھائی کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ علوم وفنون کے علاوہ تصوف اور موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ فقیری اور شاعری دونوں میں دردؔ کی تقلید کی۔ اپنے بڑے بھائی کے بعد آبائی سجادہ کو زینت بخشی، تقوےٰ، توکل زہد وقناعت کو ورثہ میں پایا۔ ۱۲۵۰ھ سے پہلے انتقال ہوا۔

اثرؔ کا کلام میر دردؔ کی طرح صاف اور سادہ ہے، لیکن درد وا ثر میں ان سے کم ہے۔

بقول مولوی عبدالحق ان کے کلام میں سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کر دی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت، نرم اور ملائم الفاظ کے ساتھ ساتھ جدت، گداز اور عاشقانہ گم شدگی ہے۔ ان کا دیوان بہت مختصر ہے۔ قریب قریب تمام غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔ ایک مثنوی خواب وخیال بھی ان کی یادگار ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

دیکھیں گے اس کی سنگ دلی کو ہم اے اثرؔ
گر کوئی نالہ ہم سے سر انجام ہو گیا

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر
مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثرؔ کی تو ہم کو آس نہیں

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا
دشمنی پر تو پیار آتا ہے

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی
تری کون سی بات پر جائیے

نظیر اکبر آبادی

۱۷۳۵ء ـ ۱۸۳۰ء

ولی محمد نام، نظیر تخلص، ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے، جائے ولادت دلّی ہے لیکن اکبر آباد (آگرہ) اتنا بسایا کہ اکبر آبادی ہو گئے۔ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ بڑے لاڈ اور پیار سے تعلیم و تربیت ہوئی۔ عربی کم فارسی زیادہ جانتے تھے۔ خود کہتے ہیں

فہم نہ تھا علم سے عربی کے سوا کچھ بھی اسے   فارسی میں ہاں مگر جانے تھا کچھ این و آں

ان کے علاوہ پنجابی، بھاشا، مارواڑی، پوربی اور ہندی زبانیں بھی جانتے تھے۔ خوشنویسی میں ایسی مہارت حاصل کی تھی کہ ہفت قلم مشہور تھے۔ دوسرے علوم وفنون، ہیئت، طب، نجوم، منطق، فلسفہ، معانی، بیان وغیرہ بھی بخوبی جانتے تھے۔ موسیقی سے فطری لگاؤ تھا اور اس فن سے بھی واقف تھے۔ ورزش اور سپہ گری میں بھی دخل رکھتے تھے۔ غرض وہ کثیر المعلومات اور ہمہ داں شخص تھے۔

منکسر المزاج، قانع، نیک دل، حلیم اور با اخلاق انسان تھے۔ شوخی، رنگینی، ظرافت و بذلہ سنجی، فطرت ثانیہ تھی، وسیع المشرب اور انسان دوستی کے پیکر تھے، سیر و تماشا ان کی گھٹی میں پڑا تھا، احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا، چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہندو مسلمان سب سے تعلقات تھے، سب کے تیوہاروں، میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے، ان کے کلام میں جو وسعت ہے ان کے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر ہے ان کا کلام ان کے اخلاق و عادات کا آئینہ ہے۔

جب تک جیئے "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" پر عامل رہے۔ عسرت میں بھی عزت و حرمت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ ۹۰ برس کی عمر میں فالج کا حملہ ہوا۔

نظیرؔ نے چلنے کی تیاری شروع کر دی۔

تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت کا نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

چار برس تک اسی مرض میں مبتلا رہے۔ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو بنجارہ نے اپنی آخری گون لادی اور بدن کی کھیپ لے کر روانہ ہو گیا۔ ہندو مسلمان دونوں نے بنجارہ کی روانگی کا ماتم کیا۔ ان کے ایک شاگرد نے اس مصرع سے تاریخ وفات نکالی۔ ع "مخمس بے سر و پا، بیت بے دل، فرد بے سر شد"

خم + بت + رد = ۱۲۴۶ھ

نظیرؔ نے بہت کچھ لکھا اور ہر موضوع پر لکھا، دو لاکھ سے زیادہ اشعار انھوں نے کہے لیکن سب ضائع ہو گئے۔ تقریباً سات ہزار اشعار کا کلیات موجود ہے۔ جس میں غزلیں، نظمیں، مثنویاں، مرثیے، قطعات، رباعیات، واسوخت وغیرہ جملہ اصنافِ سخن موجود ہیں۔ فارسی کلام بھی کافی ہے۔

اگر نظیرؔ کے مخرب اخلاق اشعار نکال دیے جائیں تو ان کی شاعری اخلاقیات کا بہترین نمونہ ہے، ان کا کلام ایک عارف باللہ کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ناصح بھی، واعظ بھی اور معلم بھی، وہ محبت اور پریم اور میل ملاپ کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ ان کی محبت صرف بنی نوع انسان کے لئے ہی محدود نہیں ہے بلکہ حیوانات اور بے جان چیزوں سے بھی انھیں اُنس ہے۔ وہ ہندوستان کے حقیقی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی سماج کا دل دھڑک رہا ہے۔ ان کے کلام میں بے پناہ موزونیت، موسیقیت پائی جاتی ہے۔ محاکات اور مرقع نگاری کا وہ بہترین نمونہ ہے۔

بیان نہایت دلچسپ اور نیچرل ہے۔ تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہے۔ وہ جدید رنگ اور جدید شاعری کے پیشرو اور امام ہیں۔ ان کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ معمولی چیزوں کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں، نئے نئے مضامین اور موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں، اور انسانی زندگی کے ہر گوشے کی ترجمانی کی ہے۔ برموقع الفاظ استعمال کرنے پر انھیں قدرت کاملہ حاصل ہے ان کا ظریفانہ رنگ منفرد ہے۔ تشبیہیں اور استعارے عام فہم استعمال کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں عریانیت اور شوخی بھی پائی جاتی ہے۔ متروکات اور غلط الفاظ بھی موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خالص ہندوستانیت، ناصحانہ روش، وسیع النظری، انسان دوستی، آزاد روی کے باعث اُردو شاعری میں منفرد و یگانہ ہیں۔ ان کے کلام میں جو تنوع، وسعت، مصوری اور ہندوستانیت ہے وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اسی لئے انھیں جدید شاعری کا بانی تسلیم کیا گیا۔ غزلوں کا رنگ یہ ہے :-

دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیرؔ — پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

سب کتابوں کے کھل گئے معنی — جب سے دیکھی نظیرؔ دل کی کتاب

نہ دل کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں — بھرا رہے ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں

نظیرؔ کا کمال ان کی فطری، اخلاقی اور فلسفیانہ نظموں میں ظاہر ہوتا ہے۔ برسات کا تماشا، بہاریں، اُمس، جاڑے کی بہاریں، مفلسی، کوڑی نامہ، پیسا نامہ، چپاتیاں، پیٹ کی فلاسفی، تن کا جھونپڑا، تندرستی کی فلاسفی، سفر آخرت کی تیاری، کرجگ، آدمی نامہ، بنجارا نامہ، ہولی، دیوالی، راکھی، عید، شب برات، کنھیا وغیرہ ایسی بکثرت نظمیں ہیں جو اُردو ادب میں زندہ جاوید رہیں گی۔

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں — جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں — عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلماں
نے رند نہ عابد نہ مے آشام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

کانٹا کسی کے مت لگا گر مثل گل پھولا ہے تو — وہ تیرے حق میں تیر ہے کس بات پر بھولا ہے تو
مت آگ میں ڈال اور کو یہ گھاس کا پولا ہے تو — سن رکھ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر پھولا ہے تو
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اُس ہات لے

میر خلیق

متوفی ۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ

میر مستحسن خلیق، میر حسن کے صاحبزادے تھے۔ دلّی میں پیدا ہوئے، فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی، سولہ برس کی عمر سے شعر و شاعری کا شوق دامنگیر ہوا، مصحفی کے شاگرد ہو گئے، تھوڑے عرصہ میں ہی باکمال ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد آخری عمر میں، غزل گوئی ترک کر کے مرثیہ گوئی شروع کی۔ غزلوں کا دیوان شائع نہ ہو سکا۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی "ہائے ائے ہے خلیق بود اُستاد"

میر خلیق اہل زبان تھے، روزمرہ اور محاورے پر انھیں کمال حاصل تھا۔ بیگماتی زبان کی ترتیب و تدوین سے وہ متعلق تھے اس لئے زبان کی صفائی روزمرہ کی صحت اور محاورے کی درستی، بندش کی چستی ان کے کلام کا جوہر ہیں۔ میر خلیق زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ انھوں نے درد و اثر کو

خالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ میر انیس کو میر خلیق کی زبان پر ناز تھا۔ "حقا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں"

مرثیوں میں میر خلیق نے رزمیہ مضامین سے احتراز کیا اور اس کو واقعات کربلا کے مصائب بیان کرنے تک محدود رکھا۔ افسوس ہے کہ ان کے مرثیے بھی علیحدہ شائع نہ ہو سکے۔ غزل کا رنگ یہ ہے :-

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا تھا ستارہ جو آسماں سے گرا
جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم
بے مروت ہو تو کیا جانے تو ظالم کیا کرے اس مروت پر تو پاس آشنا تجھ میں نہیں
ایسا تو جہاں میں کوئی ہووے گا نہ رسوا آفت جو خلیق حب گر افگار پہ آئی

ان کا ایک سلام بہت مشہور ہے۔

مجرئی طبع کند ہے لطف بیاں گیا دنداں گرے کہ جوہر تیغ زباں گیا
گزری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

میر ضمیر

متوفی ۱۲۵۵ھ

سید مظفر حسین ضمیر، ہنگھوڑ ضلع گوڑگانوہ کے رہنے والے تھے، اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آئے اور جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ آباد کیا تو ان کے والد بھی چلے آئے۔ میر ضمیر یہیں کے ہو رہے۔ ۱۲۵۵ھ میں انتقال کیا، نواب مقبول الدولہ قبول، نے تاریخ کہی ہے۔ "آہ! افسوس حسینی ذاکر"

میر ضمیر خاندانی شاعر نہ تھے، لیکن شاعری کا ملکہ خداداد تھا، طبیعت میں

آمد ہی میں حیران قیاس بشری ہے　　یہ کون سی تصویر تجلی سے بھری ہے

گو حسن کا رتبہ نہیں مذکور ہوا ہے

منبر مرا ہم مرتبۂ طور ہوا ہے

روزمرہ اور صفائی:-

جاکے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے　　یہ تو کہیے کہ غلام آپکے کچھ خوب لڑے

چیر کر فوج کو اس پار سے اُس پار گئے　　میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے

رُباعی

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے　　کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے

عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر　　کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے
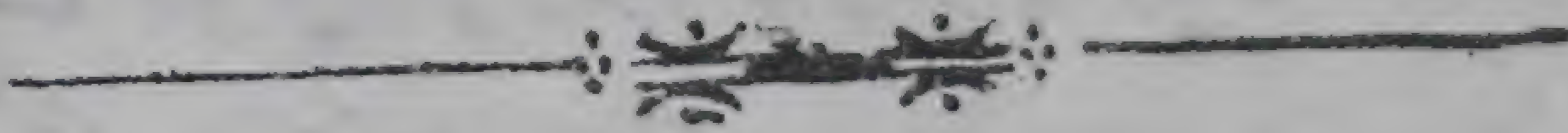
جدت و ندرت تھی، زبان پر قدرت کاملہ حاصل تھی، مصحفی کی شاگردی نے انھیں باکمال بنا دیا۔ نہایت زود گو اور پر گو تھے کئی ضخیم جلدوں میں ان کے مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے مرثیہ میں حسب ذیل اضافہ کیا:۔

۱۔ رزمیہ لکھا

۲۔ سراپا ایجاد کیا۔

۳۔ گھوڑے اور تلوار نیز دیگر اسلحہ جنگ کے اوصاف لکھے۔

۴۔ جذبات نگاری، منظر نگاری، واقعہ نگاری ان کے مرثیوں میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

۵۔ غلط اور متروک الفاظ ترک کر دیے۔

۶۔ مرثیہ کو تحت لفظ پڑھنا شروع کیا، اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔

۷۔ روایتیں نظم کرنا شروع کیں جس سے مرثیہ کے بندوں کی تعداد بارہ سے بڑھ کر سو تک ہو گئی۔

غرض میر ضمیر مرثیہ گوئی میں پہلے صاحب فن اور صاحب طرز ہیں۔ ان کی زبان صاف و سادہ، بندش چست و دلکش، کلام پر زور و پر جوش ہے، تشبیہات و استعارات عام فہم ہیں۔ میر ضمیر کی ژرف نگاہی اور دور اندیشی نے فن مرثیہ گوئی کو ایسی ترقی دی کہ وہ جملہ اصناف سخن پر حاوی ہو گیا۔ رباعیات میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔

مرثیہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے　　　کس نور سے پرنور یہ نور نظری کا ہے

جائزہ

متوسطین شعرا کا زمانہ اٹھارھویں صدی کے آغاز سے شروع ہو کر انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک ہے۔ اس سو اسو سال کی مدت میں اُردو شاعری نے غیر معمولی ترقی کی۔ یہ زمانہ اس کا سنہرا زمانہ ہے اور کئی حیثیتوں سے نہایت اہم ہے۔

۱۔ سب سے زیادہ ترقی غزل کو ہوئی، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور موضوع اور مواد کے اعتبار سے بھی۔

۲۔ میر تقی میر نے واسوخت ایجاد کیا۔

۳۔ سودا نے قصیدے اور ہجو کو معراج کمال تک پہونچایا۔

۴۔ میر حسن نے 'مثنوی' کو زندہ جاوید بنا دیا۔

۵۔ انشا اور رنگین نے ریختی ایجاد کی۔

۶۔ انشا نے اُردو کے قواعد دریائے لطافت لکھ کر با قاعدہ اُردو قواعد کا سنگ بنیاد رکھا۔

۷۔ اُردو شعراء کے تذکرے فارسی زبان میں ترتیب دیے گئے، میر نے نکات الشعراء، میر فتح علی گردیزی نے تذکرہ ریختہ گویاں، میر حسن نے تذکرۃ الشعراء، قائم نے مخزن نکات، مصحفی نے تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحا لکھا، تذکروں کی بدولت ابتدائی تنقید کی بنیاد پڑی۔

۸۔ میر خلیق اور میر ضمیر کی بدولت مرثیہ کو وسعت نصیب ہوئی۔

۹۔ نظیر اکبر آبادی پہلے عوامی اور جمہوری شاعر ہیں جنھوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور ہندوستانی روایات سے اُردو شاعری کو مالا مال کیا۔

۱۰۔ شاعری کا مرکز دہلی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ بھی ہو گیا۔ اور لکھنؤ اسکول کی بنیاد پڑی۔

۱۱۔ راسخ عظیم آبادی نے لکھنؤ اور دہلی اسکول کو ملا کر عظیم آباد میں ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی۔

ان خصوصیات کے علاوہ زبان کی صفائی اور پاکیزگی، سادگی اور سلاست کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔

فارسی ترکیبوں اور محاوروں کو اُردو کے سانچے میں ڈھال کر ایرانی سے ہندوستانی بنا لیا گیا۔

ہندی کے ثقیل اور گراں الفاظ کو خارج کیا گیا۔

سنگلاخ زمینوں اور پیچ در پیچ استعاروں سے گریز کیا گیا۔

عام فہم تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے گئے۔

ملکی اور قومی خصوصیات و روایات کو شاعری میں اہم جگہ دی گئی۔

ظرافت اور تمسخر، طنز و مزاح کو بھی شاعری میں جگہ مل گئی۔

اکثر شعراء کے کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی بھی پائی جاتی ہے۔

ادبی معرکے شعر و سخن کے لئے مفید بھی ہوئے اور مضر بھی، مفید اس لئے کہ ان کی وجہ سے زبان کی صحت و صفائی کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔

اکثر شعراء نے اظہار کمال کے لئے مشکل قافیوں، ردیفوں اور زمینوں میں غزلیں کہنا شروع کیں جس سے شاعری صرف لفظی صناعی ہو کر رہ گئی۔

تاہم اُردو شاعری کو بحیثیت مجموعی جو عروج اس زمانہ میں نصیب ہوا وہ کسی دور زمانہ میں نہیں۔ اس کا مستقبل اسی زمانہ کی بدولت درخشاں و تاباں بنا۔

متاخّرین شعراء

شاہ نصیر الدین نصیؔر

متوفی ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

شاہ نصیر الدین نصیؔر کے والد شاہ غریب تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے بڑے لاڈ و پیار سے پرورش ہوئی۔ شاعری کا ملکہ خداداد تھا، شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی جاگیر اور علاقے ملے۔ دو مرتبہ لکھنؤ اور چار مرتبہ حیدرآباد سفر کیا، مہاراجہ چندو لال نے انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ آخری مرتبہ جب حیدرآباد پہونچے تو دلّی آنا نصیب نہ ہوا اور وہیں سنہ ۱۲۵۵ھ میں وفات پائی "چراغ گل" تاریخ وفات ہے۔ ایک ضخیم مجموعہ یادگار چھوڑا۔

طبیعت میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی اور شگفتگی بھی تھی۔ نہایت پُرگو شاعر تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد میں سیکڑوں شاگرد تھے۔ بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔

سنگلاخ زمینوں اور بے حد مشکل ردیف و قافیہ میں غزلیں کہتے تھے۔

شکوہ الفاظ، نادر تشبیہات و استعارات کے شیدائی تھے۔

کلام میں زور و اثر ہونے کے باوجود بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کی کمی ہے جس ظرافت، رنگینی، رعایت لفظی بھی موجود ہے۔

زبان کی درستی و اصلاح کی طرف خاص توجہ کی۔

رنگ کلام یہ ہے :۔

افسوس کہ نرگس کی طرح باغ جہاں میں
کچھ ہم نے بجز حسرتِ دیدار نہ پایا

صیاد قفس کو نہ اُٹھا صحن چمن سے
باقی ہے ابھی مُرغ گرفتار کی حسرت

حباب وار غنیمت ہے فرصت اک دم کی
ہوا پہ زندگی مستعار رکھتا ہوں

وجہ معلوم تو ہو چیں بہ جبیں ہونے کی
سچ کہو جی میں ہے کیا کس سے لڑا چاہتے ہو

اس قدر ہم نے کیا ہے تجھ کو یاد
ایک عالم کو ہماری یاد ہے

میر سیّد علی غمگین

۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء — ۱۲۶۹ھ ۱۸۵۲ء

میر سید علی غمگین عرف حضرت جی، میر سید محمد کے صاحبزادے ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء میں پیدا ہوئے، جائے ولادت دلّی ہے۔ دولت کی آغوش میں آنکھ کھولی، تعلیم و تربیت بہت سے بہتر ہوئی، ۲۹ سال کی عمر میں میر سید فتح علی خاں گردیزی سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۱۳ء میں ترک دنیا اور ترک وطن کر کے مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے گوالیار میں مسند فقر پر بیٹھ گئے۔

فقر و تصوف نے دل میں سوز و گداز پیدا کیا۔ عشق حقیقی کے جذبات شعر و شاعری پر مجبور کرنے لگے۔ سعادت یار خاں رنگین سے استفادہ سخن کیا۔ ذوق سخن رہبر بنا اور بہت جلد استادی کے مرتبہ پر فائز ہو گئے۔ معروف اور ذوق نے مشورہ سخن کیا ہے۔ مرزا غالب سے گہرے تعلقات تھے۔

فن تصوف اور مختلف مذہبی کتابوں کے علاوہ ایک دیوان غزلیات "مخزن الاسرار" اور ایک دیوان رباعیات "مکاشفات الاسرار" یادگار ہے۔

غمگین کا کلام، تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ زبان میں سادگی اور پاکیزگی ہے۔ بیان میں شگفتگی و دلکشی ہے۔ شوخی و رنگینی بھی پائی جاتی ہے۔ میر اور مومن دونوں کا رنگ تغزل پایا جاتا ہے۔

غمگین نے ہجری سن کے اعتبار سے ۱۰۱ سال اور عیسوی سن کے اعتبار سے ۹۸ برس کی عمر پائی۔ شیفتہ نے تاریخ وفات صنعت تعمیہ میں کہی۔

زدل آہے کشیدہ شیفتہ گفت | ببرد از راصد ارے لن ترانی ۱۲۶۸ھ
--- | ۱۲ ۶۴

نمونۂ کلام :-

اس ساز دل سے نکلے ہے جو ہر نالہ سوز ناک | محتاج میں نہیں ہوں کسی سوز و ساز کا
کہنے لگا وہ سب یہ خیالات ہیں ترے | میں نے جو ذکر اس سے کیا اپنے خواب کا
نہ مغنی ہوں میں نہ مطرب ساز | ہے یہ در پردہ اور کی آواز
فصل گل میں بھی نہ صیاد نے چھوڑا ورنہ | آشیاں ہم بھی بناتے کسی گلزار کے پاس
نہ تو بندے نہ کچھ خدا ہیں ہم | ہم نہیں جانتے کہ کیا ہیں ہم

دامن سے اس کے کیونکر ہم ہاتھ اٹھائیں یارو
جب صبر کا ہمارے ہو پیرہن دریدہ

ہوں جو آگاہ تو فنا ہو جائیں | اپنی غفلت ہی زندگانی ہے
یار بے پردہ ہے روز و شب مگر | دیکھنے کو چشم بینا چاہیئے

رباعیات کا رنگ یہ ہے :-

خدمت سے خلق کی نہ رہنا محروم | اور ہو نہ سکے تو چاہیئے ہو معدوم
ممکن نہیں دو جہاں میں غمگین کوئی | بے خدمت خلق یار ہو کے مخدوم

از مسودہ مطالعہ میر سید علی غمگین۔ محمد یونس خالدی صاحب۔

مومن خاں مومن

۱۸۰۰ء - ۱۸۵۱ء

مومن خاں مومن دہلوی حکیم غلام نبی خاں کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں کوچۂ چیلاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ دہلوی نے مومن خاں نام تجویز کیا۔ عربی شاہ عبدالقادرؒ دہلوی سے پڑھی طب اپنے والد اور چچا سے پڑھی، نجوم میں اس قدر دسترس ہو گئی کہ اکثر پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوتی تھیں۔

بڑے ذہین اور طباع تھے، حافظہ اس غضب کا پایا تھا کہ ایک بار سُن کر لفظ لفظ دُہرا دیتے تھے۔ رنگین طبع، آزاد مزاج، زندہ دل، نفاست پسند، خوش لباس آدمی تھے، خودداری اور عزت نفس فطرت تھی، کبھی کسی کی شان میں نہ مدحیہ قصیدہ لکھا نہ درباداری کی، نہ ملازمت کی، سید احمد شہیدؒ کے مرید بھی تھے۔ اور ان کی تحریک سے وابستہ بھی، ان کی شان میں ایک مثنوی جہادیہ لکھی۔ تاریخ گوئی میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ اپنے مرنے کی تاریخ خود کہی تھی "دست و بازو بشکست"

شعر و سخن سے مومن کو فطری مناسبت تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا لیکن اس کے بعد ذوق شاعری ہی رہبر بنا اور اصلاح لینی ترک کر دی یعنی آفرینی نازک خیالی، جدت طرازی اور شوخی ان کی نمایاں خصوصیات ہیں، تشبیہ و استعارہ کی ندرت، طرز بیان کی جدت، شاعرانہ طنز ان کے کلام کی جان ہیں۔ فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے معمولی بات میں بھی ندرت پیدا کر دیتے ہیں۔

مومن حسن و عشق کے جذبات بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، ان کے کلام میں

سوزِ عشق، جذبات کی لطافت اور رنگین بیانی موجود ہے۔ ان کا رنگ تغزل منفرد ہے، واردات قلب اور محبت کی نفسیات کو مومن نے جس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

کلیات میں قصائد، غزلیات، مثنویات اور دیگر جملہ اصناف سخن موجود ہیں ان کی مثنویاں ان کی حیات کی آئینہ دار ہیں جن میں جذبات کی آمد اور زبان کی سلاست و روانی موجود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنشیں نزاکت آواز دیکھنا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں
سچ ہے کہ مجھ کو طاقت جور و ستم نہیں

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
اک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

مومن نے اپنے تخلص کی رعایت سے مقطعوں میں جو پر لطف معنویت پیدا کی وہ انھیں کا حصہ ہے۔

کیوں سُنے عرض مضطرب مومن | صنم آخر خدا نہیں ہوتا
بہیم سجود پائے صنم پر دمِ وداع | مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں
اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر | مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن | آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق

سنہ ۱۷۸۹ء - سنہ ۱۸۵۴ء

شیخ محمد ابراہیم ذوق، شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے، سنہ ۱۷۸۹ء میں دلی میں پیدا ہوئے، حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی۔ حافظ صاحب کو شعر و شاعری کا شوق تھا ذوق کو بھی یہ شوق پیدا ہو گیا۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہوئے اور فطری مناسبت، کثرت مشق کی بدولت چند ہی دنوں میں مشہور و ممتاز ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر ان کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ شاہ اکبر ثانی نے ایک قصیدہ کے صلہ میں ملک الشعراء خاقانی ہند کا خطاب مرحمت فرمایا مسلسل عروس سخن کے گیسو سنوارنے کے بعد ۱۶ نومبر سنہ ۱۸۵۴ء کو دنیائے اُردو کا یہ مہر درخشاں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مرنے سے چند ساعت پہلے یہ شعر کہا تھا۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا | کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق کو عربی فارسی کے علاوہ متعدد علوم موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی، نہایت ذہین تھے، حافظہ بلا کا پایا تھا طبیعت میں جدت و ندرت تھی، تمام عمر شعر گوئی میں بسر کی، اگر ان کا کلام نذر انقلاب نہ ہو جاتا تو تین چار ضخیم جلدوں سے زیادہ ہوتا۔

ذوقؔ قصیدہ اور غزل دونوں کے استاد تھے۔ وہ زبان کے بہت بڑے جوہری اور صناع تھے۔ نشست الفاظ، زبان کی صفائی اور پاکیزگی، محاورات اور امثال کے استعمال میں ان کا جواب نہیں تھا۔

الفاظ کا برمحل استعمال، فن عروض سے کماحقہٗ واقفیت، زور تخیل اور بلندی مضامین موسیقیت، غنائیت، ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔

قصیدہ کے وہ بادشاہ ہیں۔ سوداؔ کے بعد ذوقؔ ہی اس صنف میں باکمال ہوئے ہیں ان کی وسعت معلومات اور مختلف علوم سے ان کی واقفیت کا اندازہ قصیدہ ہی سے ہوتا ہے۔ زبان کی صفائی، تراکیب کی چستی، نشست الفاظ میں وہ سوداؔ سے بھی آگے ہیں۔

غزلیات میں مختلف شعراء کا رنگ موجود ہے۔ میرؔ دردؔ، جرأتؔ، شاہ نصیرؔ، سوداؔ سب کا رنگ نمایاں ہے۔ انداز بیان نہایت شستہ و پاکیزہ ہے۔ رعایت لفظی، حسن زبان، محاورہ اور ضرب المثل کا پورا پورا التزام کیا ہے۔ کلام میں اخلاقی اور صوفیانہ مضامین بھی موجود ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے :—

اس سے تو اور آج وہ بے درد ہو گیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

کہے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

نازک کلامیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصت نشاط
ہو جس کے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ دیکھو آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

دل صاف ہو تو چاہیئے معنی پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے
لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

بہادر شاہ ظفرؔ

۱۷۷۵ء - ۱۸۶۲ء

ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفرؔ، اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شاہ عالم کے پوتے تھے۔ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ سلطنت جا چکی تھی مگر شعر و شاعری ورثہ میں ملی تھی، اکبر شاہ ثانی اور شاہ عالم دونوں نے اُردوئے معلیٰ کے گیسو سنوارے تھے، شاہ عالم شاعری میں آفتاب بن کر نمودار ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدردان۔ ظفرؔ نے اقلیم سخن کی فرمانروائی میں آنکھ کھولی، تحصیل علوم و فنون کے بعد مشق سخن کرنے لگے پہلے میر عزت اللہ عشقؔ اور شاہ نصیرؔ کو کلام دکھایا اس کے بعد استاد ذوقؔ کو اُستاد بنایا۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد مرزا غالبؔ کو اصلاح کے لئے انتخاب کیا۔

ظفرؔ کی زندگی مصائب و آلام، محرومیوں ناکامیوں کا مجسمہ تھی، اکبر و عالمگیر کا وارث اتنا مجبور و بیکس ہو گیا تھا کہ قلعہ معلیٰ کے اندر بھی اطمینان و سکون سے زندگی نہیں بسر کر سکتا تھا۔ اگرچہ ۱۸۳۷ء میں دہلی کے تخت پہ بیٹھا اور بادشاہ بنا دیا گیا، لیکن اس کی حیثیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک وظیفہ خوار سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے رہی سہی شاہی بھی ختم کر دی، بادشاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ وہیں عمر کے بقیہ دن عسرت و غربت میں بسر کئے اور ۷ نومبر ۱۸۶۲ء ۱۲۷۹ھ میں قید فرنگ

وقید حیات دونوں سے رہائی حاصل کر لی۔

ظفر کا کلام سوز و گداز اور درد و اثر کا مجموعہ ہے۔ زبان کی لطافت اور پاکیزگی، بیان کی صداقت و تاثیر ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ پورا کلام زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں آپ اپنی مثال ہے۔ میر نے اپنے دیوان کے لئے کہا تھا "درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا" یہ مقولہ ظفر کے چاروں دواوین کے لئے زیادہ صحیح ہے ان کا کلام حسرت و غم اور یاس و نامرادی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشعار نہیں ہیں بلکہ قلب و جگر کے ٹکڑے آنسوؤں میں مل کے بہ نکلے ہیں۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

ہم اپنے کنج غم میں نالہ و فریاد کرتے ہیں
ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

دنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا
ہم نے یہی پایا کہ برا نام نہ پایا

حسرت ہے اس اسیر قفس پر کہ جس کے پر
اڑتے ہی پھرتے بعد فنا بھی چمن کے گرد

یوں تو مدت سے ہی الطاف و عنایات میں فرق
لیکن ایسا نہ ہو آ جائے ملاقات میں فرق

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
اب تو اس کوچے میں اے باد صبا خاک نہیں

نہیں معلوم ظفر اس سے ہوئیں کیا باتیں
چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

نہ پہنچا کوئی اپنے پاس پہنچا جب کہ وقت اپنا
اجل کو آفریں ہے وقت پر پہنچی تو یہ پہنچی

کہا جو کہتا ہوں سب بے وفا ہیں رقیب
وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو کیا ہے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

۱۷۹۶ء ۔ ۱۸۶۹ء

مرزا اسد اللہ خاں نام غالبؔ تخلص، مرزا نوشہ عرفیت، دبیر الدولہ نظام جنگ خطاب، ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے تین برس کی عمر میں یتیم ہو گئے، شفیق چچا نے سر پر ہاتھ رکھا، لیکن ابھی ۹ برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا، مرزا بے یار و مددگار ہو گئے۔ چچا کی جاگیر کے معاوضہ میں سات سو روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہو گئی۔ مرزا آگرہ سے دلی چلے آئے۔ یہیں ان کی شادی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی سے ہو گئی۔ مرزا نے اکبر آباد پر جہان آباد کو ترجیح دی اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔

مرزا کی تعلیم و تربیت باقاعدہ نہ ہو سکی، ابتدائی تعلیم آگرہ میں حاصل کی کہتے ہیں کہ فارسی ایک نو مسلم پارسی عبد الصمد سے پڑھی، اور ازلی مناسبت ہونے کی وجہ سے بہت جلد باکمال ہو گئے۔ ہندوستان کے فارسی شعراء میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے غالبؔ کے لئے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ اور خلعت مقرر کر دی تھی لیکن ۱۸۵۷ء میں پنشن اور تنخواہ دونوں ختم ہو گئیں۔ یہ زمانہ مرزا پر بہت سخت گزرا۔ کامل تین برس تک فقر و فاقہ میں گزارے۔ نواب رام پور کی کوششوں سے پنشن بحال ہو گئی لیکن تنخواہ کون دیتا؟ بہادر شاہ ظفر خود اسیر فرنگ ہو کر رنگون میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ البتہ نواب رام پور نے سو روپیہ تنخواہ مقرر کر دی۔ مرزا کی بسر اوقات کے لئے یہ تنخواہ اور پنشن ناکافی تھی، عمر بھر فارغ البالی نصیب نہ ہو سکی۔

مرزا کا حلقۂ احباب نہایت وسیع تھا۔ ان کے تلامذہ بھی بکثرت تھے اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔

مرزا نے مختلف مقامات کے سفر بھی کئے، کلکتہ، لکھنؤ، رام پور قابل ذکر ہیں آخر عمر میں بیماری نے زندگی اجیرن کر دی تھی۔ مرنے سے پہلے یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں وفات پائی، درگاہ نظام الدین اولیاءؒ کے متصل ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

مرزا غالب نہایت خلیق، باوضع، ظریف الطبع، شگفتہ مزاج، بذلہ سنج انسان تھے۔ حالی نے انھیں حیوان ظریف کہا ہے۔ طبیعت میں فیاضی، سیر چشمی و بے تکلفی، خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مذہبی تعصبات سے آزاد تھے۔ رواداری، خلوص اور اخلاق کے پتلے تھے۔

اُردو فارسی دونوں کے زبردست شاعر اور انشا پرداز تھے، دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔

فارسی میں۔ کلیات نثر فارسی، کلیات نظم فارسی، لطائف غیبی، تیغ تیز، قاطع برہان، پنج آہنگ، سبد چیں، مہر نیم روز، دستنبو وغیرہ اور

اُردو میں۔ عود ہندی، اُردوئے معلّٰی دو حصوں میں، یہ خطوط کے مجموعے ہیں۔ اور دیوان اُردو یادگار ہیں۔ دیوان میں غزلیات اور چند قصیدے ہیں۔

مرزا کی شاعری کو تین دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلا دور۔ فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ اور اس زمانہ کا کلام بیدل کی روش پر ہے۔ عجیب و غریب تشبیہیں، ناقابل فہم بلند پروازیاں بکثرت ہیں۔

طرز بیان نامانوس اور اشعار بعید الفہم ہوتے ہیں۔ اسی زمانہ کے کلام کے متعلق کہا گیا ہے۔

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

دوسرے دور میں فارسی کا اثر کم ہوتا گیا، مرزا بیدل کی نازک خیالی اور نکتہ آفرینی کی جگہ زبان کی صفائی اور سادگی بیان نے لے لی، فارسی تراکیب اور محاورات کے استعمال میں بھی کمی آگئی۔ مگر فکر و نظر کی بلندی موجود ہے۔

تیسرے دور میں مرزا اپنے پورے کمال فن کے ساتھ نمایاں ہیں، سادگی و پرکاری اختصار و جامعیت، سلاست و روانی، لطافت زبان، نزاکت بیان، ندرت خیال، جدت ادا ان کے کلام کی جان ہیں۔

مرزا غالب کا کلام اپنی خصوصیات کے اعتبار سے مجموعۂ اوصاف ہے۔

جدت طرازی ان کے کلام کی بنیادی خصوصیت ہے، وہ روش عام سے ہٹ کر چلنے کے عادی ہیں۔

شاعری میں بھی انھوں نے اپنی نئی راہ الگ نکالی۔

ان کا کلام، ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات، احساسات و جذبات کا آئینہ دار ہے، غم عشق و غم روزگار، آپ بیتی جگ بیتی سب کچھ موجود ہے۔

انھوں نے تصوف و فلسفہ کے مسائل بھی شاعرانہ پیرایہ میں بیان کئے ہیں فلسفہ کی خشکی اور بے کیفی ان کی شعریت کو مجروح نہیں کر سکی۔

ان کی ہمہ گیر طنزیہ ظرافت اور لطیف شوخی اور بذلہ سنجی سے ان کا کلام زعفران زار بنا ہوا ہے۔ نشاط غم نے مصائب و آلام کو کیف و سرور سے بدل دیا ہے

ان کے کلام میں الفاظ کا انتخاب لاجواب ہے، کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا کرنے پر انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ معمولی سے معمولی اور

پامال مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں دلکشی، جدت و ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔

مرزا کی انھیں خصوصیات نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ مرزا کے کلام کی مقبولیت و افادیت بڑھتی جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

۱۸۰۶ء - ۱۸۶۹ء

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب مرتضیٰ خاں کے فرزند تھے۔ ۱۸۰۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت نامور علماء کی نگرانی میں ہوئی۔ عربی فارسی میں کمال حاصل کیا۔ شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی، حکیم مومن خاں مومن کے شاگرد ہوگئے اور اپنی سخن سنجی و سخن فہمی کی بدولت بہت جلد مشہور و ممتاز ہوگئے۔ مومن کے انتقال کے بعد غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ آخری عمر میں شاعری کم کردی تھی۔

شیفتہ اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں حسرتی تخلص تھا، ان کی سخن فہمی کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ جھوٹ اور مبالغہ سے پرہیز کرتے تھے، سیدھے سادے انداز میں جدت و ندرت پیدا کرنے میں کمال حاصل تھا۔ زبان صاف اور بامحاورہ ہے۔ مومن کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔

شیفتہ کی یادگار متعدد کتابیں ہیں۔

نظم میں ایک فارسی دیوان اور ایک اُردو دیوان ہے۔

نثر میں۔ تذکرہ گلشن بے خار جس میں اُردو شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے۔ ایک سفر نامہ ہے لیکن یہ کتابیں فارسی میں ہیں۔

غالب کی وفات کے بعد اسی سال ۱۸۶۹ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیانہ ہنوز

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ | دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں
آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ | طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں
آہ و زاری نارسا، شوقِ اسیری بے اثر | کون لائے آشیانے تک مرے صیاد کو
ناصح تری زبان کے تو بس میں نہ ہو تو پھر | انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے
ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کاہے کو تھا | شیفتہ اس کو تو لو تم سے محبت نکلی
وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی | میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ | اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

شیخ امام بخش ناسخ

۱۷۷۲ء - ۱۸۳۹ء

شیخ امام بخش ناسخ، شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے ۵ محرم ۱۱۸۶ھ م ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن فیض آباد میں بسر ہوا۔ جوانی میں لکھنؤ آئے، اور یہیں علمائے فرنگی محل سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شعر میں مصحفی کے شاگرد تھے اور انہی سے مشورہ سخن کرتے تھے، لیکن عام طور پر مشہور ہے کہ وہ کسی سے اصلاح نہیں لیتے تھے۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا اور کھانا بھی کافی مقدار میں کھاتے تھے۔ عمر بھر شادی نہیں کی کبھی کسی کی ملازمت نہیں کی کسی امیر کی شان میں قصیدہ نہیں کہا۔ غازی الدین حیدر نے شاہی لقب اختیار کرنے کے بعد انھیں اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا تھا مگر انھوں نے انکار کر دیا اس پر بادشاہ ناراض ہوا اور انھیں ۱۲۳۱ھ میں لکھنؤ سے نکلنا پڑا، اور الہ آباد چلے گئے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد پھر لکھنؤ چلے آئے، مگر دوبارہ لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور فیض آباد، الہ آباد، بنارس، کانپور، پٹنہ میں

تھوڑے تھوڑے دن قیام کرکے پھر لکھنؤ آگئے ۲۴ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۸۳۸ء میں وفات پائی ۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی ۔
"ڈلا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے" ۱۲۵۴ھ ۔ عیسوی تاریخ ہے "صد حیف ہائے ناسخ صد حیف ہائے ناسخ" ۱۸۳۸ء
محض تخلص کی حد تک ہی ناسخ نہیں تھے بلکہ حقیقتاً قدیم طرز کو منسوخ کر گئے
ایک جدید طرز کے بانی بھی تھے ، لکھنؤ کی شاعری میں انھوں نے ہی سب سے پہلے تصنع
غریب تشبیہات اور رعایت لفظی کو داخل کیا اس لحاظ سے ان کا نام تاریخی اہمیت
رکھتا ہے ، شاعری سے زیادہ انھوں نے قواعد اور عروض پر زور دیا ایسے الفاظ و افعال
وغیرہ جو اپنی ساخت کی وجہ سے بھدے اور ثقیل معلوم ہوتے تھے اُن کو متروک قرار دیا
غزل میں ان کا انداز یکسر تصنع تھا وہ شعر کی ظاہری آرائش پر ہی تمام توجہ صرف کرتے تھے
عربی و فارسی کے ادق اور مشکل مضامین کو استعمال کرکے غزل کو بوجھل اور سامعہ پر
بار بناتے میں کمال حاصل تھا ۔ محاوروں اور الفاظ کی صحت کا خاص خیال رکھتے
تھے ۔ ناسخ نے ان اصلاحات پر اتنی زیادہ توجہ کی کہ ان کے اشعار بے کیف سے
ہو گئے ۔ زبان کو وسعت عطا کرنے کے لئے نئی تشبیہات ، نئے استعارات کا اتنا زیادہ
استعمال کیا کہ بعض بعض تشبیہیں اور استعارے دور از کار ہو گئے لیکن اس انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ ان کا کلام ٹھوس ہے ، شعر کی روانی ، محاورات و الفاظ کی صحت ان کے
کلام کو خاصے کی چیز بنا دیتی ہے ۔

ناسخ کی اہمیت ایک مصلح زبان کے اعتبار سے اُردو ادب میں نہایت اہم ہے
ان کے شاگردوں کی تعداد بکثرت ہے جن میں بیشتر استادی کے مرتبہ پر فائز ہیں ۔

شیخ ناسخ کے کلیات میں تین دیوان ہیں جن میں دو زیادہ مشہور ہیں ان میں غزلیں
رباعیاں اور قطعات تاریخ ہیں ، تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا ، ایک اخلاقی مثنوی

"نظم سراج" کے نام سے اور دوسری "مولود شریف" کے نام سے مرتب کی تھی۔

تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شب فراق گئی روز انتظار آیا

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کیا آواز کا
تیر جو آواز دے ہو نقص تیر انداز کا

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دل کا بیابان رہ گیا

رنگ عشرت باغ عالم میں نظر آتا نہیں
گل کو گلچیں کا خطر بلبل کو غم صیاد کا

جام مے لبریز ہیں ساقی فقط مطرب نہیں
گل کھلے ہیں باغ میں خالی ہے جائے عندلیب

میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار
اے ناصحو بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھ کو

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

فرقت قبول رشک کے صدمے نہیں قبول
کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

کیا برستی ہے بجائے ابر رحمت بے کسی
ہے یہی تربت مقرر ناسخ مغفور کی

خواجہ حیدر علی آتش

۱۷۷۸ء ۔ ۱۸۴۷ء

خواجہ حیدر علی نام آتش تخلص۔ آتش کے والد خواجہ علی بخش دلّی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دلّی کی تباہی کے بعد فیض آباد میں آکر پناہ لی۔ یہیں آتش ۱۷۷۸ء میں پیدا ہوئے کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا لہذا تعلیم پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکی بعد میں فارسی و عربی کسی حد تک پڑھ لی تھی۔ جب لکھنؤ دار الخلافہ بنا تو آتش لکھنؤ چلے آئے، اس زمانہ میں انشا و مصحفی کے معرکے زور پکڑ رہے تھے انھیں بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا اور مصحفی کے شاگرد بن گئے،

تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا کلام پختہ ہوگیا اور خود استاد ہوگئے۔ آتش فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اکثر فاقے کی نوبت آجاتی تھی۔ اسی روپیہ ماہانہ بادشاہ لکھنؤ سے ملتا تھا پندرہ روپیہ گھر میں دیتے تھے اور باقی راہ خدا میں بانٹ دیتے تھے۔ ضعیفی تک بانکپن اور سپاہیانہ وضع کے ساتھ رہے آخر وقت میں بینائی جاتی رہی ۲۵ محرم ۱۲۶۲ھ کو انتقال کیا۔ میر وزیر علی حسین فوق نے تاریخ کہی "لکھنؤ میں نام آتش کر گئے" "چراغ جہاں" بھی تاریخ وفات ہے۔

آتش، ناسخ کے ہمعصر تھے۔ جن سے مشاعروں میں ہنگامہ آرائی رہتی مگر یہ سب نوک زبان تک محدود رہتی سودا اور انشا کی طرح ہاتھا پائی کی نوبت نہ آتی۔ ناسخ کا کلام رنگین، پُر شکوہ اور خیالی دل آویزیوں کا مرقع ہے اور آتش نے جہاں ناسخ کی خارجی شاعری کی پیروی نہیں کی وہاں ان کا کلام سادگی درد اور تاثیر لئے ہوئے ہے۔ ناسخ کی طرح انھوں نے بھی مصرف غزلیں کہی ہیں۔ کلام میں تخلص کی رعایت سے گرمی ہے ناسخ جیسا تکلف اور تصنع نہیں۔ خواجہ آتش کی پہلی خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورات کا بہترین صرف ہے۔ روزمرہ اور بول چال کا استعمال آتش کے کلام میں بے حد لطف دیتا ہے۔ وہ ثقیل الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں آسان اور موثر زبان، خیالات بلند اور اشعار میں روانی اور جاذبیت ہے اگرچہ سوز و اثر ان کے کلام میں کم ہے پھر بھی ان کے اشعار پُرلطف ہوتے ہیں کہیں کہیں ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ لکھنوی اساتذہ میں آتش کا شمار ناسخ کے بعد ہوتا ہے۔ آتش کے دو دیوان ہیں جن میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ آتش نے بھی بکثرت شاگرد چھوڑے جن میں اکثر باکمال ہوئے۔

نمونہ کلام یہ ہے :-

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پہ
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ کر چلے گئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

برا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

فرشِ گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیرِ سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست

مشتاق دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہی آرہی
دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

دیا شنکر نسیم

سالہ ۱۸۱۱ء - ۱۸۴۳ء

پنڈت دیا شنکر نام، نسیم تخلص ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ ذات کے کشمیری برہمن تھے۔ ابتدا میں عربی و فارسی میں تعلیم حاصل کی۔ ملتی طبیعت اور ذہانت نے شاعری کا شوق پیدا کیا۔ غرضکہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا اچھا خاصا مذاق پیدا کر لیا، آتش کے شاگرد ہوئے اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی، افسوس کہ صرف ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مثنوی گلزارِ نسیم، نسیم کا شاہکار ہے۔ گل بکاؤلی کا قصہ نثر میں پہلے سے موجود تھا، نسیم نے ۱۲۵۴ھ میں اسے مثنوی کا روپ دیا۔ یہ مثنوی لکھنوی دبستان کی عاشقانہ مثنوی ہے، فن کے لحاظ سے اور تخئیل کے اعتبار سے یہ مثنوی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مثنوی کا خاص جوہر اختصار، پختگی کلام، تناسب لفظی، بندش کی چستی ہے، سچ تو یہ ہے کہ نسیم نے تناسب لفظی کی صنعت کو بامِ عروج تک پہونچا دیا ہے۔ کلام میں پختگی ہے، صنائع بدائع کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ واقعہ نگاری، منظر کشی، مضمون آفرینی اور سلاست و روانی ان کے کلام کا خاص حصہ ہے، ایک شعر میں معنی کے اعتبار سے کئی کئی شعر کے مضامین بھر دیئے ہیں، لطف یہ ہے کہ ہر جگہ مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔

نسیم کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے جس میں علاوہ غزلوں کے چند مخمس و ترجیع بند بھی ہیں۔ نسیم کی غزلیات میں آتش کے کلام کی طرح دنیا سے بے پروائی خودداری، زندگی کی بے ثباتی اور بے باکی ہر جگہ نمایاں ہے، استعاروں کی ندرت اور تشبیہوں کی دل کشی سے کلام میں شگفتگی بڑھ جاتی ہے۔

نمونۂ کلام

مُنھ دُھونے جو آنکھ ملتی آئی	پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو گُل ہوا ہوا ہے	کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گُل	جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون	ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پر اگر پڑا نہیں ہے | بو ہو کے تو گل اڑا نہیں ہے
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا | پتلی وہی چشم حوض کا تھا

غزلیات میں بھی یہی رنگ ہے۔

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑ یو | دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے
ذرے کا بھی چمکے گا ستارہ | قائم جو زمین و آسماں ہے
جو داغ کہ مہر ہے فلک پر | دل میں ترا اب تلک نہاں ہے

کس سوچ میں ہو نسیم بولو
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

میر ببر علی انیس

سنہ ۱۸۰۲ء - سنہ ۱۸۷۴ء

میر ببر علی انیس، میر مستحسن خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے تھے۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن وہیں گزرا۔ ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی سے حاصل کی۔ شاعری اور زبان دانی ورثہ میں ملی تھی۔ فطری مناسبت نے رہنمائی کی۔ اپنے پدر بزرگوار سے اصلاح لینی شروع کی۔ فن سپہ گری میں میر امیر علی سے کمال حاصل کیا۔ جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ بسایا تو یہ بھی چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

انیس پہلے حزیں تخلص رکھتے تھے۔ لیکن ناسخ کے مشورہ سے بدل کر انیس رکھ لیا۔ میر انیس انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد چار و ناچار مختلف مقامات پر گئے۔ عظیم آباد، بنارس، حیدرآباد، الہ آباد، ہر جگہ ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

میر صاحب کے کمال کی جو قدر و منزلت لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر ہوئی وہ اُردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوسکی۔ مرزا دبیر ان کے مدمقابل ضرور تھے لیکن شہرت و مقبولیت میں میر صاحب کا حصہ زیادہ تھا۔

میر صاحب نہایت خوش آواز، خوش بیان، خوش ادا، خوش وضع، خود دار، خلیق، پابند وقت اور نفاست پسند انسان تھے، تمام عمر اپنی خودداری اور عزت نفس کو قائم رکھا۔

میر صاحب کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو مغرب کے وقت لکھنؤ میں ہوا مرزا دبیر نے تاریخ وفات لکھی۔

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

میر انیس کے احسانات سے اُردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اس زبان کو وہ ترقی وسعت و جامعیت عطا کی کہ دوسری ترقی یافتہ زبانیں بھی رشک کرنے لگیں۔

ان کا کلام فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، سادگی و پرکاری، تشبیہات و استعارات، جدت و ندرت، نازک خیالی و نکتہ آفرینی، روزمرہ اور محاورہ، صنائع و بدائع کا حسین و جمیل پیکر ہے۔

وہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے حسب موقع الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور صحت الفاظ، روزمرہ اور محاورہ کے استعمال پر خاص توجہ دیتے ہیں۔

جذبات انسانی، واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے بیان کرنے پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔

ان کو کردار نگاری میں کمال حاصل ہے۔ مرثیوں میں ڈرامائی عناصر موجود ہیں۔

انیس کے مرثیوں نے اُردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی "رزمیہ شاعری" کو پورا کر دیا۔

مرثیوں کے علاوہ سلام اور رباعی میں بھی وہ اعلےٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔

غرض انیسؔ نے شستہ و پاکیزہ زبان میں حسنِ بندش اور چستی ترکیب سے فصاحت و سلاست کے جو دریا بہائے ہیں وہ اُردو زبان کو ہمیشہ سرسبز و شاداب کرتے رہیں گے۔ انیسؔ کے مرثیے پانچ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مناظرِ قدرت

وہ لُو وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب — کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب — خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جذبات نگاری

ٹھہرو عنانِ توسنِ عمرِ رواں نہ لو — ساقی تھکا ہوا ہے رہِ کارواں نہ لو
کروٹ کراہ کر مرے آرام جاں نہ لو — لگتی ہے چوٹ دل پہ مرے ہچکیاں نہ لو
مر جاؤں گا میں ساتھ اگر چھوٹ جائے گا
بھائی مرا تو رشتۂ جاں ٹوٹ جائے گا

سلام

مرا رازِ دل آشکارا نہیں — وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں
کسی نے بھی تیری طرح سے انیسؔ — عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

رُباعی

رتبہ جسے دُنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

مرزا سلامت علی دبیر

۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء

مرزا سلامت علی دبیر ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

مرزا کی استعداد علمی کافی تھی، نہایت ذہین اور طباع تھے۔ بحث و مباحثہ اور درس تدریس کے بڑے شائق تھے۔ گو خاندانی شاعر نہ تھے مگر شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی، میر ضمیر کے شاگرد ہوئے، اور تھوڑے عرصہ میں مرثیہ گوئی میں مشہور و مقبول ہو گئے۔ میر انیس کے حریف مرزا دبیر ہی تھے۔ دونوں استادوں کے تلامذہ دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہو گئے جو انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں خوب خوب ادبی معرکے ہوئے، الفاظ کی تراش خراش ہیروں کی طرح کی جانے لگی۔ اس سے زبان کی صحت و صفائی، سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت میں اضافہ ہوا، انداز بیان حسین و دلکش ہوا۔

مرزا دبیر نے بھی تمام عمر مرثیہ گوئی میں گزاری، میر انیس کے ایک سال بعد ۱۸۷۵ء میں مرزا دبیر کا انتقال ہو گیا۔ کسی اہل کمال نے میر انیس اور مرزا دبیر کی تاریخ ایک ہی مصرعہ سے نکالی۔ غم انیس میں ہے ہے دیاد دبیر کا غم

۱۲۹۱ھ — ۱۲۹۲ھ

مرزا دبیر کا کلام کئی ضخیم جلدوں میں ہے ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

زبان پر شکوہ اور انداز بیان باوقار ہے۔ تُہ زور خیالات بیان کرنے میں وہ کہیں کہیں انیس سے بھی آگے ہیں۔

مضمون آفرینی، جدت و ندرت ان کا طرۂ کمال ہے۔

زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور شعر کے ظاہری محاسن ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

حقیقت نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری پر کمال حاصل ہے۔

رکاکت اور ابتذال، صنعت گری اور خالص رعایت لفظی سے گریز کرتے ہیں۔

ان کے کلام میں محاسن، نئی ترکیبیں، بندشیں، تشبیہات اور استعارات موجود ہیں۔

دقت پسندی اور معنی آفرینی کی وجہ سے کلام میں کہیں کہیں پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔

وہ تخیل کے بادشاہ ہیں مگر زور تخیل میں اصول بلاغت اور صحت زبان کو اکثر جگہ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن ان کے کمال پر حرف نہیں آتا۔

جذبات نگاری

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر روکر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نور عین نے
منہ رکھ کے آسمان کو دیکھا حسین نے

رُباعی

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

میر مظفر علی اسیر

متوفی ۱۲۹۹ھ ۔ ۱۸۸۱ء

میر مظفر علی اسیر، میر مدد علی کے بیٹے تھے۔ امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، فارسی، عربی میں کامل استعداد حاصل کی۔ مصحفی سے اصلاح سخن لی۔

اسیر کو اودھ کے دربار سے عزت بھی ملی اور اسیری بھی۔ واجد علی شاہ کے الطاف خسروانہ نے رہائی دی اور ماہانہ مقرر کر دیا۔

لکھنؤ اُجڑنے کے بعد اسیر رام پور پہونچے۔ نواب رام پور نے سرپرستی فرمائی اسیر عمر بھر نواب، کی قدردانیوں کے اسیر رہے اور وہیں ۱۲۹۹ھ میں رحلت فرمائی۔

ان کی ادبی یادگاریں فارسی کا ایک دیوان، اُردو کے چھ دیوان اور کئی مثنویاں ہیں، کئی رسالے عروض و قافیہ، صرف و نحو پر ہیں۔

اسیر کے تلامذہ میں امیر مینائی، منشی احمد علی شوق، انجم نیشاپوری وغیرہ بہت مشہور ہوئے ہیں۔ اسیر نہایت پُرگو اور زود گو تھے، ان کو جملہ اصناف سخن پر قدرت کاملہ حاصل تھی، ان کے کلام میں زبان کی صفائی اور روانی موجود ہے۔ مگر رعایت لفظی بھی پائی جاتی ہے۔ انداز بیان میں بھی جدت و ندرت ہے۔ رنگ تغزل ہر جگہ نمایاں ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اس کے دامن سے مرے خون کا دھبہ دھوتا
تجھ سے اتنا بھی تو اے دیدۂ گریاں نہ ہوا

اُٹھنا اُنھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے
حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپشِ دل

احباب کی نظر میں سبک ہوں تو ہوں اسیر
کرتا ہوں شکر دل پہ کسی کے گراں نہیں

دھوم محشر میں ہوئی جب تری آمرزش کی
بے گنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

باقی ابھی ہے ترک تمنا کی آرزو کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آتی شب ہجر اے فلک کوئی تو اُمید بر آئی ہوتی

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی

بہت آئے گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

منیرؔ شکوہ آبادی

۱۸۱۴ء سے ۱۸۸۰ء

سید اسماعیل حسین منیرؔ ابن سید احمد حسین شاہ شکوہ آباد ضلع مین پوری میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ شیخ ناسخؔ کے شاگرد ہوئے۔ مختلف مقامات پر بسلسلۂ ملازمت رہے۔ ریاست باندہ کے نواب علی بہادر کے استاد ہوئے۔ انقلاب کے بعد ان کو بھی قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ رہائی کے بعد نواب رام پور کے درباری شاعروں میں شامل ہو گئے اور وہیں ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔

ناسخؔ کے شاگردوں میں منیرؔ کا پایہ بہت بلند ہے ان کی شہرت کا دار و مدار قصائد پر ہے۔ سوداؔ اور ذوقؔ کے بعد قصیدہ گوئی میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔ الفاظ پُر شکوہ بندشیں چست اور خیالات بلند ہیں۔ تشبیب میں ندرت پیدا کرتے ہیں۔ مبالغہ کی طرف زیادہ مائل ہیں اگرچہ انھوں نے مثنویاں بھی لکھیں لیکن ان کا نام قصائد کی بدولت زندہ ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب کے چند شعر یہ ہیں:-

ہوا ہے خندۂ گل کا یہ شور دنیا میں سنائی دیتی نہیں رعد کی بھی صوتِ عظیم

رہا مِن دہر میں ہے گوش گل کو یہ قوت سُنائی دیتی ہے صوتِ ہزار باغ نعیم

منے ہوئے ہیں اصولِ فروع گلشن دہر زمانہ کو نہیں کہہ سکتے دہریئے بھی قدیم

چمن سے موج رطوبت گئی جو تا بہ فلک
اٹھا بہشت میں طوفانِ کوثر و تسنیم

واجد علی شاہ اختر

۱۸۲۲ء - ۱۸۸۷ء

واجد علی نام، اختر تخلص، اودھ کے آخری تاجدار تھے۔ ولیعہدی کے زمانے جانِ عالم لقب تھا۔ ۱۸۴۷ء میں جب تخت پر بیٹھے تو "سلطان عالم" خطاب اختیار کیا۔ زندہ دلی اور رنگین مزاجی ان کی فطرت میں داخل تھی، فنونِ لطیفہ، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی، عمارت سازی اور شعر و شاعری سے بہت شوق رکھتے تھے بہت سے شعرا دربار سے متعلق تھے۔ علوم و فنون کی سرپرستی میں اختر پیا کا جواب نہیں تھا۔ لیکن نا یہ محفل بہت جلد سونی ہو گئی۔ انقلاب زمانہ نے اسیر فرنگ کر کے جلا وطن ہونے پر مجبور کیا۔ سفید فام اور مہذب نما درندوں نے قید کر کے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا۔ انھوں نے لکھنؤ سے کلکتہ تک کے سفر کا حال ایک مثنوی "حزن اختر" میں لکھا ہے وہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور جان عالم پیا تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اُردو کی جملہ اصناف سخن، قصیدہ، مثنوی، غزل، مرثیہ کے علاوہ ٹھمری، گیت اور دادرہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ نظم و نثر میں بہت سی تصانیف لکھیں جن کی تعداد ۲۸ تک پہونچتی ہے۔ ۱۸۸۷ء میں کلکتہ میں وفات پائی۔ شعر میں اصلاح میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے لیتے تھے ان کے بیٹے کوکب اور نواب برجیس قدر بھی شاعر تھے۔

اختر کے کلام میں رعایت لفظی کے ساتھ مضامین کی چستی ملتی ہے، خیالات میں لطافت و نزاکت اور سوز و گداز ہے۔ سلاست بیان، شیرینی زبان اور فصاحت ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا
آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

وسعت خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حب وطن
تنگیِ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

یوں تو شاہان جہاں پر ہے پڑا وقت مگر
ختم ہے اختر بے کس پہ جفائے غربت

کب تلک عمر بسر کیجیے صحرا میں یاد
پھاڑیے جوش میں وحشت کے گریباں تا چند

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

چاک دل کی دوا کہاں اختر
اس کا بخیہ نہ ہوگا سوزن سے

امیر مینائی

۱۸۲۸ء - ۱۹۰۰ء
۱۲۴۴ھ - ۱۳۱۸ھ

نام امیر احمد، تخلص امیر، باپ کا نام کرم محمد ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب لکھنؤ کے مشہور بزرگ مخدوم شاہ مینا صاحبؒ سے ملتا ہے اسی لیے مینائی کہلاتے ہیں۔ تعلیم علمائے فرنگی محل سے پائی۔ عربی اور فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ بہت منکسر المزاج عابد و زاہد و متقی و پرہیزگار تھے۔ بچپن ہی میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا اور منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہوئے۔ تھوڑی سی مشق کے بعد شہرت حاصل کر لی۔ واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہو گئی۔ بیالیس سال رام پور میں رہے اور داغ سے گہری دوستی ہو گئی۔ داغ حیدر آباد گئے تو ان کو بھی بلا لیا۔ امیر وہاں جاتے ہی بیمار ہو گئے اور ایک ماہ بعد سنہ ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا۔ داغ نے تاریخ کہی۔

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصر عالی پائے جنت میں امیر

امیر کا ابتدائی کلام بڑی حد تک ناسخ کے رنگ میں ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ

تمثیلی شاعری خشک نہیں ہے اور نہ تصنیع کی شاعری بے مزہ ہے۔ امیر کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے ان کا کلام فصیح، شیریں، سلیس اور لوچدار ہے۔ امیر کو صحت زبان روزمرہ اور محاورہ کا خاص خیال رہتا تھا۔ ان کی غزلیں تصوف اور عشق و محبت کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ذوق سخن بہت پاکیزہ ہے، خیالات میں گہرائی اور جذبات و احساسات میں رنگینی و ندرت ہے۔ فن کی تکمیل و پختگی، طرز ادا کی سادگی و بے ساختگی کے ساتھ ہے۔ جذبات میں اصلیت و واقعیت کا غلبہ ہے۔ امیر نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

امیر مینائی صاحب کثیر التصانیف ہیں۔ بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں نثر و نظم دونوں میں انھوں نے کتابیں لکھی ہیں۔

نثر میں :- خیابان آفرینش، انتخاب یادگار (شعرائے رامپور کا تذکرہ) امیر اللغات (نامکمل) وغیرہ۔

نظم میں :- مرآۃ الغیب، صنم خانۂ عشق، محامد خاتم النبیین (نعتیہ کلام) مینائے سخن نور تجلی، ابر کرم وغیرہ۔

امیر کے شاگردوں میں جلیل، مضطر، ریاض، وسیم جیسے باکمال شعراء ہوئے ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے :-

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل | کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا
وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب | مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا
گل ہوا غنچہ تو آواز یہ اس سے آئی | جمع پھر دل نہیں ہوتا ہے پریشاں ہو کر

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی — یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

نہ کر لے پاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو — اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوار چمن بلبل — تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

داغ دہلوی

۱۸۳۱ء ۱۲۴۶ھ — ۱۹۰۵ء ۱۳۲۲ھ

نواب مرزا خاں نام، تخلص داغ، باپ کا نام نواب شمس الدین خاں ۱۸۳۱ء میں دلی میں پیدا ہوئے، چھ سات برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے صاحبزادے مرزا فخرو سے شادی کر لی، اس سلسلے میں داغ کو بھی لال قلعہ کی صحبت نصیب ہوئی اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ قلعہ میں چونکہ شعر و شاعری کا چرچا تھا مرزا فخرو بھی شاعر تھے اور رمز تخلص کرتے تھے اس لئے داغ کو بچپن ہی میں شاعری کا شوق ہو گیا اور وہ ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ فارسی کی تعلیم مولوی غیاث الدین سے حاصل کی، خوشنویسی، شہسواری، اور شمشیر زنی کی تربیت بھی حاصل کی، مرزا فخرو ۱۸۵۶ء میں فوت ہو گئے اس کے بعد داغ اپنے خاندان سمیت رام پور چلے آئے اور نواب کلب علیخاں کے مصاحب خاص اور داروغہ اصطبل بنے، چوبیس ۲۴ سال کے بعد نواب کلب علیخاں کی وفات پر رام پور چھوڑ دی، لکھنؤ، کلکتہ، پٹنہ وغیرہ مختلف مقامات کا سفر کیا ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد گئے وہاں ان کی بہت قدر و منزلت ہوئی اور ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی جو بعد میں پندرہ سو تک پہنچ گئی۔ مقرب السلطان بلبل ہندوستان، استاد جہاں، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک خطاب

عطا ہوا زندگی سکون اور عیش و عشرت کے ساتھ بسر ہونے لگی۔ حیدر آباد ہی میں فالج گرا، زبان بند ہوگئی اور ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۵ میں انتقال کیا اور وہیں آرام گاہ بنی۔

داغ کی تصانیف میں چار دیوان گلزار داغ، آفتاب داغ، ماہتاب داغ، یادگار داغ ہیں۔ ایک مثنوی فریاد داغ اور چند قصائد اور رباعیات بھی یادگار ہیں۔ دلّی کی تباہی پر ایک پُر جوش اور درد انگیز شہر آشوب مسدس میں ہے۔

نواب مرزا خاں داغ اُردو کے مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز شاعر ہوئے ہیں۔ دلّی کی ٹکسالی زبان، روزمرہ کی صفائی، فصاحت و سلاست، مضمون کی شوخی بیان کی ندرت، تیکھا پن، معاملہ بندی، سہل ممتنع ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے انھوں نے بڑی حد تک گریز کیا ہے۔ پیچ در پیچ استعارے اور بعید از کار خیالات ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ بعض جگہ شوخی، عریانیت اور ابتذال کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ ان کی غزلوں میں رطب و یابس بھی ہے لیکن اس سے ان کے کمال پر حرف نہیں آتا۔ ان کا یہ دعوے صحیح ہے۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ   سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ کے شاگردوں میں اچھے شاعروں کی تعداد خاصی ہے، بعض مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر اقبال، احسن مارہروی، سائل دہلوی، نوح ناروی بیخود دہلوی، سیماب اکبرآبادی، بیخود بدایونی، جگر مرادآبادی، آغا شاعر قزلباش دہلوی، میر محبوب علی خاں نظام دکن متخلص بہ آصف۔ عاشق ٹونکی وغیرہ۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

اک حرف آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے   اتنی سی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

نومید کرم ہو کر ہم مے سے کریں توبہ   دوزخ میں پڑے زاہد بے لطف ثواب ایسا

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر
دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

اے داغ جو کہا ہے اسے کر دکھائیں گے
انسان کیا وہ جس کو نہ ہو بات کا خیال

غم دو جہاں بھی ہے کافی مجھے
مگر آدمی کو قناعت نہیں

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

محسن کاکوروی

۱۸۲۳ء - ۱۹۰۵ء
۱۲۴۲ھ - ۱۳۲۲ھ

محمد محسن نام، محسن تخلص، قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ امیر مینائی کے بعد لکھنوی شعراء میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ محسن کے والد مولانا حسن بزرگ اور عالم تھے۔ محسن نے سات سال کی عمر میں اپنے دادا حسین شہید کے زیر سایہ تربیت حاصل کی۔ کتب درسیہ مولوی عبدالرحیم اور اپنے والد سے پڑھیں، مین پوری میں وکالت کی۔ سارا شہر محسنی اخلاق کا شیدائی تھا، سچے عاشق رسول تھے۔ مذہبی عقیدت اور رسالت مآب کی محبت رگ رگ میں سرایت کر رہی تھی۔ ان کے زمانے میں لکھنؤ میں ایک طرف ہوس رانی اور عیش و عشرت کا دور دورہ تھا، دوسری طرف مرثیہ گوئی معراج کمال پر پہونچ رہی تھی۔ محسن نے اس عیش و عشرت کے زمانے میں نعت گوئی شروع کی اور شاعری میں مولانا محمد ہادی علی اشک سے مشورہ کیا اور اپنے دادا حسین شہید سے بیعت کی۔ مذہب کے سختی سے پابند تھے، تین چار بجے صبح سے اٹھ کر عبادت میں

مشغول ہو جاتے، مرتے دم تک اس کے پابند رہے، آخر ۲۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کو معبود حقیقی سے جا ملے۔

فن نعت گوئی میں محسن کاکوروی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے کلام میں وطنی تشبیہات اور تلمیحات زیادہ ہیں، بیان میں زور ہے، کلام میں لطافت اور پاکیزگی ہے، بے جا مبالغہ، مغلق الفاظ بعید الفہم تشبیہات سے کلام پاک ہے، خیالات کی طرح زبان بھی پاکیزہ اور شیریں ہے۔ اس پر لفظی اور معنوی صنعتوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ قصائد میں بلندی مضامین، شکوہ الفاظ اور چستی بندش نمایاں ہے۔ ہندی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی اور کثرت سے کرتے ہیں۔ ایک قصیدہ کی تشبیب کا نمونہ۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل	برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سروقدان گوکل	جا کے گنگا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی	کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی	ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانب قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ	کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات وہبل

جلال لکھنوی

۱۸۳۴ء – ۱۹۰۷ء
۱۲۵۰ھ – ۱۳۲۵ھ

حکیم سید ضامن علی نام جلال تخلص، والد کا نام حکیم اصغر علی داستان گو ۱۸۳۴ء ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں تعلیم پائی بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف راغب تھے شروع میں امیر علی خاں ہلال کے شاگرد ہوئے، پھر ہلال ہی کے

توسط سے ان کے استاد علی اوسط رشک کو اپنا کلام دکھانے لگے جب رشک عراق کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھیں نواب فتح الدولہ برق کے سپرد کیا۔ جلال ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور چلے گئے اور ۲۰ سال تک وہیں رہے۔ نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد ریاست منگرول چلے گئے۔ پھر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ۱۹۰۹ء میں ۷۶ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

شاعری میں انھوں نے ابتداءً قدیم طرز کو اپنایا یا خارجی عناصر اور رنگین بیانی پر زور دیا علوِ تخئیل و پرجوش انداز بہت کم ہے، کلام غلطیوں سے پاک ہے۔ زبان و محاورات اور عروض کے لحاظ سے اشعار صحیح و مستند ہیں۔ لطافت زبان اور تحقیق الفاظ کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔ جلال نے قصائد پر بھی کافی توجہ کی قصائد میں شکوہ الفاظ کے ساتھ مضمون آفرینی ہے، کبھی کبھی تشبیب میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس صنف شاعری میں کوئی خاص شہرت نہ حاصل کر سکے۔

ان کے شاگردوں میں ان کے بیٹے کمال، میر ذاکر حسین یاس، آرزو اور احسان شاہجہاں پوری بہت مشہور ہوئے ہیں۔

جلال نے نظم و نثر دونوں میں بہت سی کتابیں لکھیں۔

نثر میں سرمایۂ زبان اردو، گلشن فیض، مفید الشعراء، منتخب القواعد، افادۂ تاریخ، دستور الفصحا اور نظم میں چار دیوان، شاہدِ شوخ طبع، کرشمہ جات سخن، مضمون ہائے دلخوش، نظم نگاریں۔ زیادہ مشہور ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

جی خوب بہلتا ہے بھلا ہو کہ بُرا ہو
سُن لیتے ہیں ناصح سے کچھ افسانہ کسی کا

اُٹھے جو بزم یار سے تنہا ہم آئے گھر
طاقت کہیں، حواس کہیں، دل کہیں رہا

اندازۂ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا
کم حوصلہ ہمیں ہیں وہاں کچھ کمی نہیں

جگر کا درد کھویا اور نہ کی دل کی تڑپ ائل — مسیحا سے پوچھتے ہیں کس مرض کی پھر دوا تم ہو
جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہے — نہ یہ ناداں سمجھتا ہے نہ وہ جاہل سمجھتا ہے

تسلیم

۱۸۲۰ء سے ۱۹۱۱ء

منشی احمد حسین، معروف نام منشی امیر اللہ، تخلص تسلیم ۱۸۲۰ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی عبد الصمد ہے۔ ان کے والد لکھنؤ چلے آئے اور نواب محمد علی شاہ کی فوج میں ملازم ہوئے۔ تسلیم بھی پہلے فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ عربی و فارسی مختلف حضرات سے پڑھی، اپنے زمانے کے ممتاز شاعر تھے۔ نواب کلب علیخاں کے عہد میں تسلیم رام پور چلے گئے اور وہاں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد منگرول میں قیام کیا۔ مگر نواب حامد علی خاں نے پھر رام پور بلا کر چالیس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ تسلیم نے اکیانوے برس کی عمر پائی۔ ۱۹۱۱ء میں بمقام رام پور انتقال کیا۔

شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ مثنوی میں تسلیم کا پایہ بلند ہے، نہایت پرگو تھے۔ ان کا کلام سلیس، بے تکلف اور زور دار ہے، صفائی فصاحت اور دلپذیری بھی پائی جاتی ہے۔ غزل میں روانی کے ساتھ ساتھ، صداقت، رنگینی اور درد و اثر بھی ہے۔ قصائد بھی پر شکوہ اور زور دار ہیں۔

تسلیم کا پہلا دیوان غدر میں تلف ہو گیا۔ تین دیوان نظم ارجمند، نظم دل فروز، دفتر خیال، شائع ہو چکے ہیں۔ اور آٹھ مثنویاں نالۂ تسلیم، شام غریباں،

صبحِ خنداں، دل و جاں، نغمۂ بلبل، شوکتِ شاہجہانی، گوہرِ انتخاب، تاریخِ رام پور کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ نواب رام پور کا سفرنامۂ یورپ بھی منظوم لکھا تھا جس میں بیس پچیس ہزار اشعار تھے۔ تسلیم کے شاگردوں میں حسرت موہانی اور عرش گیاوی بہت مشہور ہوئے۔

اجل خفا ہے، فلک مدعی، زمیں دشمن مرا جہان میں کوئی نظر نہیں آتا

تنگیِ کنجِ قفس، رنجِ اسیری، داغ گُل
اتنے سامانِ ستم، اور ایک جانِ عندلیب

خشک گُل، افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں اُداس
جی بھر آیا عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر

دو دن کی زندگی ہے اسیری میں عندلیب
فکرِ قفس کرے کہ اسیری کا غم کرے

گُل ہوں تو جگر چاک ہوں بُو ہوں تو پریشاں
ہر رنگ میں اک آفتِ غم دل سے لگی ہے

جائزہ

انیسویں صدی کا نصف آخر اردو شاعری کا زریں زمانہ ہے اس زمانہ میں ملک بھر میں سیکڑوں شعراء عروس سخن کے گیسو سنوار رہے تھے۔ انھیں کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ اردو شاعری نے لفظی ومعنوی حیثیت سے ترقی کی، بالغ نظر اور صاحب کمال شعرا اور فن کاروں کی ادبی بصیرت نے اس کو گہرائی وگیرائی، وسعت وجامعیت، لطافت وپاکیزگی، رنگینی ودلکشی عطا کی۔

شاہ نصیر دہلوی اور شیخ ناسخ لکھنوی جیسے الفاظ کے جوہری اور صناع بزرگوں نے الفاظ کے نگینوں کی تراش خراش شروع کی۔ ثقیل اور نامانوس، نیز ہندی کے کریہ الصوت الفاظ کو خارج کیا گیا۔ زبان کی اصلاح کے اصول وقواعد بنائے گئے۔ ذوق نے بھی معنویت سے زیادہ لفظی حسن وجمال کی طرف توجہ کی۔

زبان میں صفائی، نفاست، سلاست اور دلکشی پیدا ہوئی، روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سے زبان کو خوش ذائقہ بنایا گیا، تشبیہات واستعارات کی آرائش سے اس کے حسن میں چار چاند لگے، فارسی اور عربی الفاظ کا عمل دخل زیادہ ہوا۔ رعایت لفظی نے بھی مقبولیت حاصل کی۔

فکر ونظر میں بلندی اور گہرائی آئی۔ جذبات وخیالات میں پاکیزگی آئی۔ انداز نظر اور رنگ سخن بدلا۔ فلسفہ وتصوف، حکمت وموعظت کے خیالات غزلوں میں ادا کئے جانے کا عام رواج ہوا۔

اصناف سخن میں غزلوں کا رواج دلوں پر قائم رہا، انقلاب ۱۸۵۷ء اور عام تباہی کے باوجود شعرا نغمات حسن وعشق گاتے رہے۔ غزل کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت

مرثیہ گوئی کو ہوئی۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے واقعات کربلا کو اس دردناک پیرایہ میں بیان کیا کہ ہر گھر ماتم کدہ بن گیا، مرثیہ کی وجہ سے اُردو شاعری میں اخلاقی شاعری، رزمیہ شاعری، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کا اضافہ ہوا۔ رباعیات کی طرف بھی توجہ کی گئی۔

مثنوی کو مقبولیت حاصل رہی، گلزار نسیم نے ایجاز و اختصار کا اعجاز پیش کیا۔ اس کے علاوہ متعدد عشقیہ مثنویاں، زہر عشق، طلسم الفت، حزن اختر وغیرہ لکھی گئیں۔ قصائد کا ستارہ گردش میں آگیا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے رہی سہی شاہی و نوابی، ریاست و امارت، حکومت و سلطنت بھی ختم کردی۔ والیان تخت و تاج خود دانہ دانہ کو محتاج ہو گئے۔ قصیدہ کی زندگی، انھیں کی سرپرستیوں اور فیاضیوں کی بدولت تھی۔ تاہم رام پور، حیدرآباد، بھوپال وغیرہ سرپرستی کرتے رہے اور قصائد کا نام و نشان باقی رہا۔

نعتیہ قصائد بھی لکھے گئے، محسن کاکوروی کا نام اس سلسلہ میں کافی ہے۔
شعراء نے شاعری کے علاوہ تالیف و تصنیف کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے شعراء کے متعدد تذکرے، اُردو لغات اور کارآمد رسالے وغیرہ لکھے۔

جدید شاعری

متاخرین شعراء کے زمانے سے مغربی نظریات و رجحانات اُردو شاعری میں جگہ پانے لگے تھے اور رفتہ رفتہ اُردو کے قدیم رنگ کو تبدیل کرتے جا رہے تھے لیکن یہ اہم تبدیلی مولانا محمد حسین آزاد کے اس لیکچر سے ہوتی ہے جو اُنھوں نے ۱۵ اگست سنہ ۱۸۶۷ء کو دیا تھا اس کے بعد جدید طرز کی شاعری کی بنیاد انجمن پنجاب میں بزم مناظمہ کے قیام سے پڑی جس میں مصرع طرح کے بجائے کسی عنوان پر نظم کہی جاتی تھی، یہ بزم سنہ ۱۸۷۴ء میں قائم ہوئی اس سے پہلے سر سید کے تہذیب الاخلاق نے بھی جو سنہ ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا تھا جدید رجحانات کی توسیع و اشاعت میں اہم حصہ لیا، جن شعراء نے ان رجحانات کو اپنا کر اُردو شاعری کے مزاج کو بدلا اور اس کو جدید نظریات قبول کرنے کے قابل بنایا پہلے اُنھیں کا ذکر کیا جاتا ہے اس کے بعد دورِ حاضر کے غزل گو، نظم نگار اور ترقی پسند شعراء کا حال لکھا جائے گا۔

(۱)

مولانا محمد حسین آزاد

سنہ ۱۸۳۳ء - سنہ ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد سنہ ۱۸۳۳ء میں دہلی کے مشہور مجتہدین خاندان میں پیدا ہوئے، آپ کے پدر بزرگوار مولوی محمد باقر زبردست عالم اور دیندار سید بزرگ تھے آزاد نے اسی علمی ادبی اور مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی، شفیق اور بزرگ باپ کی آغوش شفقت میں تربیت پائی، اس کے بعد مولوی محمد باقر نے حضرت ذوق جیسے باکمال شاعر کے سپرد کر دیا،

باکمال باپ کا بیٹا، باکمال استاد کی تعلیم و تربیت پا کر علم و ادب کا مہر درخشاں بن گیا۔

ذوق کے علاوہ مولانا آزاد نے دہلی کالج میں بھی تعلیم حاصل کی اور عربی فارسی میں کمال حاصل کیا۔

۱۸۵۴ء میں شفیق استاد کا انتقال ہو گیا۔ آزاد کے دل پر جو بیتی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ استاد کی موت کے بعد حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے یہ تعلق بھی ختم کر دیا۔ سرمایۂ شعر و سخن سب نذر انقلاب ہو گیا۔ شفیق اور بوڑھے باپ کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ دل شکستہ آزاد دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہونچے۔ پنڈت من پھول میر منشی لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سر رشتہ تعلیم میں جگہ مل گئی۔ رفتہ رفتہ میجر فلر ڈائرکٹر تعلیمات تک رسائی ہو گئی، میجر فلر آزاد کی قابلیت سے بیحد متاثر ہوا۔ ان کو اردو، فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور کیا۔ اس کے بعد کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر تعلیمات ہوئے کرنل موصوف کو اردو کی توسیع و اشاعت سے خاص دلچسپی تھی۔ آزاد نے اسی کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۷۴ء میں، بزم مناظمہ قائم کر کے اردو شاعری میں جدید رجحانات و عصری میلانات کے ادا کرنے کی باقاعدہ کوشش کی۔ اس میں مصرع طرح کے بجائے نظم کے لئے کوئی عنوان دے دیا جاتا تھا اور شعرا اسی پر نظمیں لکھتے تھے۔ آزاد اور مولانا حالی اس کے روح رواں تھے۔

مولانا آزاد سرکاری اخبار "اتالیق" پنجاب، اور پنجاب میگزین کے ایڈیٹر بنے [illegible] کے بعد گورنمنٹ کالج میں عربی فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔

مولانا نے ایران، کابل اور بخارا کا سفر بھی کیا تھا، جدید فارسی میں ایرانیوں سے زیادہ کمال حاصل کیا۔

۱۸۸۷ء میں گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا۔

۱۸۸۹ء سے آزاد کے دماغ میں جنوں کے آثار ظاہر ہونے لگے، رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھتا گیا۔ جوان بیٹی کی موت نے اس میں اور اضافہ کیا۔ آخر اسی عالم بے خودی اور جذب و جنون میں ۲۲ر جنوری ۱۹۱۰ء کو ۸۰ سال کی عمر میں علم و ادب کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

مولانا آزاد نے نثر و نظم دونوں میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اگرچہ ان کا کمال نثر میں ظاہر ہوا تاہم ان کی انفرادیت نظم میں بھی مسلم ہے۔ ان کی نظم نگاری غزل گوئی سے بہتر ہے۔ منظر نگاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ ان کی شاعری فطرت پرستی، حق پسندی اور حیات انسانی کی تفسیر ہے۔ تشبیہات و استعارات کا حسب موقع استعمال کیا گیا ہے۔ انداز بیان پُر جوش اور رواں ہے۔ اسی جوش بیان میں کہیں کہیں تعقید، اور بندش کی سُستی کا نقص پیدا ہو گیا۔ ان کی شاعری میں جمود، پستی، بے حسی اور مایوسی نہیں۔ وہ زندہ اور متحرک ہے۔ آزاد کی شاعری کے چار دَور کئے جا سکتے ہیں۔

پہلا دور۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے، اس میں انھوں نے غزلیں کہیں لیکن یہ سب سرمایہ تلف ہو گیا۔

دوسرا دور۔ ۱۸۶۴ء تک ہے، یہ آزاد کی پریشانی کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں نوحہ و سلام و مرثیہ وغیرہ لکھے افسوس کہ یہ سرمایہ غم بھی ضائع ہو گیا۔

تیسرا دور۔ ۱۸۶۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں آزاد اردو شاعری کے مصلح اور مجدد بن کر سامنے آتے ہیں اور جدید اردو شاعری کے بانی ہونے کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں۔

چوتھا دور۔ ۱۸۸۷ء سے شروع ہوتا ہے یہ ان کے جذب و جنون کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں آزاد نے زیادہ تر غزلیں لکھیں۔

درسی کتابوں کے علاوہ آزاد نے نثر و نظم میں کم و بیش ۲۰ کتابیں لکھیں۔ نظم میں ان کی حسب ذیل کتابیں ہیں :-

نظم آزاد، قومی و اخلاقی نظموں کا مجموعہ۔

خمکدۂ آزاد، غزلیات و قصائد اور قطعات کا مجموعہ۔

ان کے علاوہ بیاض آزاد بھی ہے جس میں پسندیدہ اشعار کا انتخاب کیا ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے :-

مدت کے بعد آئی جو گلشن میں ہے بہار ... فیض ہوا ہے پھر ہوا باغ جہاں نیا

مثال ابر کرم فیض عام کرتے ہیں ... وہی ہیں خوب کہ جو خوب کام کرتے ہیں

بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن ... کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں

تم خوب، غیر خوب، بُرے ہیں اگر تو ہم ... تم کو ہماری بات بھلی، کب بھلا لگی

ایک نظم "چلے چلو" کا پہلا بند۔

ہے سامنے کھُلا ہوا میداں چلے چلو ... باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو

دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو ... ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو

چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی

۱۸۷۳ء - ۱۹۱۰ء

منشی درگا سہائے سرور، حکیم پیارے لال کے بیٹے تھے دسمبر ۱۸۷۳ء میں بمقام جہان آباد ضلع پیلی بھیت پیدا ہوئے۔ تعلیم وہیں حاصل کی۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا، مولوی کرامت حسین بہار کے شاگرد ہوئے۔

دن رات کی مشق سخن نے باکمال بنا دیا۔ نہایت زود گو اور پُر گو تھے، زندگی نے وفا نہ کی، ۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء میں ۳۳ سال کی عمر تھی کہ اُردو شاعری کا سرور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

سرور کا کلام نیچرل، سادہ، پر جوش، رنگین اور موثر ہے۔ سوز و گداز اور حُسن بیان، شگفتگی و روانی، تشبیہات و استعارات کا بر محل استعمال، منظر نگاری اور واقعہ نگاری سرور کی شاعری کا اصل جوہر ہیں۔ نیچرل شاعری میں سرور کا جواب نہیں۔

کلام کے دو مجموعے 'خمخانۂ سرور' اور 'جام سرور' شائع ہو چکے ہیں۔ سرور نے زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں یہاں 'بچہ اور ہلال' کے دو بند بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں:-

رنگیں ادا ہیں دونوں، رنگیں جمال دونوں
نورس ثمر ہیں دونوں اور نونہال دونوں
بچے ابھی اگرچہ ہیں خورد سال دونوں
بڑھ کر کریں گے اک دن کسب کمال دونوں
آ مل کے ساتھ کھیلیں، ہم تم ہلال دونوں

تو بڑھ کے بدر ہو گا جس طرح آسماں پر
ڈالے گا اپنی کرنیں اس تیرہ خاکداں پر
میرا شباب یوں ہی آئے گا عنفواں پر
شفقت کا نور میں بھی برساؤں گا جہاں پر
آ مل کے ساتھ کھیلیں ہم تم ہلال دونوں

مولانا الطاف حسین حالؔی

۱۸۳۷ء ۔ ۱۹۱۴ء

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی، خواجہ ایزد بخش کے فرزند رشید ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ علم و ادب، شرافت و نجابت کا حصہ ورثہ میں پایا۔ بچپن ہی میں ماں باپ دونوں کی شفقتوں سے محروم ہوگئے۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے تعلیم و تربیت کی۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ اگرچہ تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہ سکا لیکن شوق علم رہبری کرتا رہا، اور اسی کی بدولت حالی مجدد ادب، جدید شاعری کے امام، سعدی ہند، اردو کے پہلے ممتاز نقاد اور صاحب طرز نثر نگار ہوگئے۔

حالی فکر معاش میں گھر سے نکلے، پہلے حصار میں ملازمت کی لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی وجہ سے ایک ہی سال میں بدقت تمام پانی پت واپس آگئے، چار برس کے بعد پھر دلی گئے، وہاں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ملاقات ہوگئی، شیفتہ نے اپنے لڑکوں کا اتالیق مقرر کر دیا، شیفتہ کا ساتھ ۸ برس تک رہا۔ اس صحبت سے حالی کو بہت فائدہ ہوا۔ اسی زمانہ میں مرزا غالب سے تعلقات بڑھ گئے اور حالی نے مرزا سے اصلاح لینا شروع کی۔ حالی نے شیفتہ سے مستفیض اور غالب کے شاگرد ہونے کا اقرار کیا ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں ۔۔۔ شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

۱۸۶۹ء میں غالب اور شیفتہ دونوں کا انتقال ہوگیا۔ حالی بے سہارا ہوگئے کچھ دنوں کے بعد لاہور پہنچے اور وہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں درسی کتابوں کی

عبارت درست کرنے پر مامور ہوئے، اس کام سے حالی کو مغربی علوم کی وسعت و جامعیت کا علم ہوا اور انھیں مشرقی علوم ہیچ نظر آنے لگے۔ سرسید سے ملاقات بھی اسی زمانہ میں ہوئی۔ حالی سرسید کی تحریک میں دل و جان سے شریک ہوگئے اور آخر وقت تک اس سے وابستہ رہے۔ لاہور سے دہلی کالج میں تقرر ہوگیا، یہ زمانہ حالی کی زندگی کا بہترین زمانہ ہے، ان کے ادبی شاہکار اسی زمانہ کے ہیں۔ جب حیدرآباد سے ادبی وظیفہ ملنے لگا تو حالی نے ملازمت ترک کردی اور پانی پت آکر گوشۂ تنہائی میں "ادبی خدمت" کرنے لگے۔ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا۔ آخر ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو علم و ادب کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے "غم شبلی بماتم حالی" سے تاریخ وفات نکالی۔

حالی محبت و اخلاص، ادب، اخلاق، عجز و انکسار، شرافت و انسانیت کے پیکر تھے۔ تمام عمر، قوم و ملک اور زبان کی خدمت کرتے رہے، ان کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ایسے پر خلوص، دردمند، بلند فکر، بے ریا اور اعلے اخلاق کے ادیب اب کہاں ؟

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حالی نے نثر و نظم دونوں میں بہت کچھ لکھا، ان کی تصانیف زندہ جاوید ہیں۔

نثر میں :۔ مجالس النساء، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات جاوید، مقالات حالی۔

نظم میں :۔ مسدس حالی، مناجات بیوہ، چپ کی داد، مجموعہ نظم حالی، دیوان حالی، تحفۃ الاخوان وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

حالی جدید اُردو شاعری کے امام اور بہت بڑے محسن ہیں۔ نئے مضامین

اور نئے اسلوب بیان سے انھوں نے شاعری کا دائرہ وسیع کر دیا۔

حالیؔ نے غزل، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس، قطعہ وغیرہ سب میں طبع آزمائی کی ہے۔ مجموعی طور پر کلام بے انتہا سادہ ہے۔ واقعیت اور اصلیت پر مبنی ہے۔ بے جا مبالغہ اور تصنع سے عاری ہے۔

غزلیات میں قدیم وجدید رنگ پایا جاتا ہے۔ قدیم غزلوں میں عاشقانہ جذبات نہایت تیز و پراثر ہیں، سادگی و پرکاری، لطیف کنائے اور اشارے۔ اعتدال و اختصار، سلاست و فصاحت، بے تکلفی اور ترنم ان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ مغربی ادب سے متاثر ہونے کے بعد حالیؔ کو غزل گوئی بے وقت کی راگنی معلوم ہونے لگی۔

ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالیؔ کی جدید غزلیں زیادہ تر سپاٹ ہیں تاہم ان میں سچائی، سادگی اور تاثیر موجود ہے۔

منظومات حالیؔ، اردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں، جن میں منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ اخلاق و تعلیم، جذبات نگاری، صداقت پسندی اور سادگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ کلام میں غالبؔ، میرؔ، مومنؔ، مصحفیؔ سب کا رنگ پایا جاتا ہے۔

مسدس مدوجزر اسلام، مناجات بیوہ، مرثیۂ غالب، رباعیات و قطعات و غزلیات۔ اردو ادب کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا   ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام   کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

مناجاتِ بیوہ۔ زبان، بیان، درد و اثر کے اعتبار سے اُردو شاعری کا تاج محل ہے۔

ریت کی سی دیوار ہے دنیا   اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
آج ہے پانا کل ہے کھونا   آج ہے ہنسنا کل ہے رونا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے   اس نگری کی ریت یہی ہے
سکھ پہ یہاں کے اترانا کیا   دُکھ پہ یہاں کے گھبرانا کیا

حالی کی رباعیات و قطعات گلدستۂ اخلاق و نصیحت ہیں۔

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو   روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا   ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

مولانا شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء ۔ ۱۹۱۴ء

علامہ محمد شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ضلع ہی میں حاصل کی بعد میں مستند علماء سے عربی، فارسی، معقولات، فقہ، حدیث، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۳ء میں سرسید کی قدر شناس نگاہوں نے شبلی کو علی گڈھ میں عربی و فارسی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ علی گڈھ میں پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہوئی اور اُن کے ساتھ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کو گئے پھر حیدرآباد پہنچے گئے اور وہاں ناظم علوم و فنون کے عہدے پر چار سال مامور رہ کر لکھنؤ آئے۔ دارالعلوم ندوہ کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں اعظم گڈھ جا کر دارالمصنفین کا منصوبہ بنایا، اس منصوبے کو

عملی جامہ پہنانے بھی نہ پائے تھے کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں فرشتۂ موت نے اپنی آغوش میں لے لیا اور علم و ادب کا یہ نیرِ تاباں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

شبلی، بیک وقت مورخ، ادیب، انشا پرداز اور بلند پایہ نقاد کے علاوہ فارسی اور اُردو کے خوش گو اور خوش فکر شاعر بھی تھے، دونوں زبانوں میں ان کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اُردو میں اُنھوں تے شاعری اس وقت شروع کی جب ملک کی فضا داغ اور امیر کی غزل خوانیوں سے گونج رہی تھی اور دوسری طرف مولانا آزاد اور حالی کی نیچرل شاعری سے ادبی دنیا میں انقلاب رونما ہو رہا تھا، مولانا شبلی تے اخلاقی شاعری میں طبع آزمائی کی اور تاریخی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی عنوانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تاریخی واقعات کو نظم کا جامہ پہناتے کی ابتدا شبلی ہی تے کی بعد میں دیگر شعرا تے ان کی تقلید کرتے ہوئے متعدد تاریخی واقعات نظم کئے۔ شبلی نے شعر و ادب کا انتہائی پاکیزہ ذوق پایا تھا۔ ان کی نظموں میں سچائی، پاکیزگی، شگفتگی، دلکشی، سادگی و رعنائی موجود ہے۔

شبلی کی نظمیں سیاسی رجحانات کی ترجمان ہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک لفظ میں ظلم و ستم سے بغاوت اور آزادی کے لئے مرنے کی تڑپ موجود ہے۔ ایک نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو　　یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ شر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے　　ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا　　ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک
عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں　　ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زر فشاں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

اسماعیل میرٹھی

۱۸۴۴ء — ۱۹۱۷ء

مولوی محمد اسماعیل ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے، سولہ سال کی عمر میں سرشتہ تعلیمات میں ملازمت کرلی اپنی قابلیت کی بدولت جلد ہی سہارن پور میں ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے۔ ۱۸۸۸ء میں سنٹرل اسکول آگرہ گئے۔ ۱۸۹۹ء میں وہیں سے بارہ برس کے بعد پنشن لے کر اپنے وطن چلے آئے بقیہ عمر تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو انتقال کیا۔

مولوی اسماعیل نے ابتدا میں غزلیں بھی کہیں مگر عمر کا بیشتر حصہ بچوں کے لئے سبق آموز اخلاقی اور نیچرل نظمیں لکھنے پر صرف کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو درسی ریڈریں ہیں یہ کتابیں عرصہ دراز تک کورس میں داخل رہیں اور اب تک ان کی مقبولیت و افادیت میں فرق نہیں آیا۔ مولوی اسماعیل کو سرشتہ تعلیم میں رہ کر بچوں کے دل و دماغ سے واقف ہونے کا بہت اچھا موقع ملا جس سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور انھوں نے بچوں کے لئے آسان و سہل زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں اس انداز سے لکھیں کہ پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں مستفید و متاثر ہونے لگے۔ حکومت نے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں خان صاحب کا خطاب عطا کیا تھا۔

مولوی اسماعیل کے کلام کے تین حصے کئے جا سکتے ہیں ایک تو وہ حصہ جن میں بچوں کے لئے نظمیں وغیرہ ہیں دوسرا وہ جس میں نیچرل نظمیں ہیں اور تیسرا حصہ وہ جس میں عاشقانہ و صوفیانہ مضامین ہیں، بچوں کی نفسیات کا انھوں نے خوب مطالعہ کیا تھا چھوٹی چھوٹی باتوں سے عمدہ نتائج پیدا کرنا ان کا کارنامہ ہے۔ ان کی نظموں میں سلاست، روانی، لطافت، اور سادگی پائی جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو شعر کے

جامہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ منظر نگاری میں وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی قومی نظموں کا رجحان زیادہ تر اصلاحی ہے اتحاد و اتفاق کی تعلیم کے علاوہ کام کرنے اور پاکباز رہنے کی تعلیم زیادہ ہے وہ اپنا اصلاحی مقصد قصائد وغیرہ میں بھی نہیں بھولتے اور غزلوں میں تصوف کے مسائل اور عشقیہ مضامین پُر زور انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مگر شوخی اور تاثیر کی کمی ہے ان کا انداز بیان سیدھا سادا ہے۔ ان کے کلیات میں قصائد، رباعی، سلام مرثیہ اور غزل وغیرہ جملہ اصناف شاعری موجود ہیں۔ انھیں انگریزی کی نظموں کے ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ تھا، جہاں کہیں انھوں نے نظم کا ترجمہ نظم میں کیا ہے سادگی اور سلاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ کلام کا رنگ یہ ہے :-

ہیں بے قرار، منزل مقصود بے نشاں
رستہ کی انتہا نہ ٹھکانا مقام کا

اب اور ڈھونڈھئے کوئی جولان گہ جنوں
صحرا بقدرِ وسعتِ یک گام ہو گیا

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

ہے اشک و آہ راس ہمارے مزاج کو
یعنی پلے ہوئے اسی آب و ہوا کے ہیں

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے
راحت طلبی موجبِ راحت نہیں ہوتی

ہے آج رُخ ہوا کا موافق تو چل نکل
کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے

صرف کہنے سے کہیں چلتا ہی کام
کام کرنے کو تو ہمّت چاہیے

آزادی

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلّت کے حلوے سے بہتر

جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اُس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

اکبر الہ آبادی

۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء

سید اکبر حسین نام تھا اور اکبر تخلص ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء میں تحصیل بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے ان کے والد صوفی منش تھے اور چچا سید وارث علی بارہ کے تحصیلدار تھے، اکبر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اپنی ذہانت کی بدولت وہ ہمیشہ ممتاز نمبروں سے پاس ہوئے۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ کچھ دنوں میں نائب تحصیلدار ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے ہائی کورٹ کی وکالت پاس کر کے منصف ہو گئے۔ آخر میں جج خفیفہ کے عہدے پر فائز ہوئے ۱۹۰۵ء میں پنشن پائی، ۱۹۰۶ء میں عدالتی خدمات کے صلے میں حکومت نے "خان بہادر" خطاب عطا کیا اسی سال الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال کیا۔

اکبر کو شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا لیکن ان کی شاعری کا آغاز ۱۸۶۲ء میں ہوا، آتش کے شاگرد وحید الہ آبادی سے اصلاح لینے لگے، ابتدا میں اکبر بھی اسی زمانہ کے رنگ میں شعر کہتے تھے یعنی سیدھے سادے الفاظ میں مضامین باندھنا۔ لیکن صفائی اور سادگی اس زمانہ میں بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔ اکبر کو شہرت اس وقت نصیب ہوئی جب انھوں نے قدیم رنگ کو خیرباد کہہ کر شوخی و ظرافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس وقت سر سید کی تعلیمی تحریک شباب پر تھی، مسلمانوں کے دو گروہ پیدا ہو گئے تھے ایک گروہ سر سید کا حامی تھا اور مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم ضروری سمجھتا تھا اور دوسرا گروہ مغربی تعلیم کا سخت مخالف تھا اسی میں اکبر بھی تھے انھوں نے

انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب و تمدن کا مضحکہ اڑانا شروع کیا وہ مغرب کی اندھی تقلید دیکھ کر اہل مشرق کو طرح طرح سے سمجھاتے کہ مغرب کی پیروی آنکھ بند کر کے نہ کرو بلکہ اپنے میں جوہر پیدا کرو جس سے ملک کی حالت بہتر ہو۔ انھوں نے ملک کے سیاسی اور قومی حالات اور ہنگامی واقعات پر بے حد لطیف اور قہقہہ انگیز نظمیں لکھیں، اس عہد کی شاعری میں اکبر نے تصنع اور نازک خیالی سے پرہیز کیا ہے۔ اکبر کی شاعری کا مقصد زیادہ تر اصلاح ملک و قوم ہے انھوں نے اپنی شاعری میں انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں لیکن ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے رنگ میں بے مثل تھے۔

اکبر کی غزلوں میں لفظی اور معنوی خوبیاں پائی جاتی ہیں، قوافی بڑے چست اور ترکیبیں زوردار ہیں، زبان شیریں اور سلیس ہے۔ ان کے کلام کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے جس میں سے بیشتر کلام اکبر کے نام سے چار حصوں میں شائع ہو چکا ہے نمونہ کلام یہ ہے:۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول
یہ بات منحصر ہے تمھاری نگاہ پر

ہو جس طرف طبیعت لازم ہے شوق کامل
ہر بات میں اثر ہے ہر رنگ میں مزا ہے

اکبر کا خاص رنگ طنز و مزاح ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو کہ نہ ہو

منشی نوبت رائے نظرؔ

۱۸۶۶ء - ۱۹۲۳ء

نوبت رائے نام نظرؔ تخلص، ۱۸۶۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہی حاصل کی، سن شعور کے پہونچنے پر شاعری کا شوق پیدا ہوا آغا مظہرؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور جلد ہی استاد بن بیٹھے زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کی ترقی کے لئے گزرا، ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ سے ایک رسالہ خدنگ نظر جاری کیا جس میں نثر و نظم کا انتخاب کرنا شروع کیا، ۱۹۰۴ء میں نظرؔ رسالہ زمانہ کانپور کے نائب مدیر چنے گئے ان کی خدمات سے زمانہ کی شہرت میں اضافہ ہوا ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد سے مشہور رسالہ ادیب نہایت شان و شوکت کے ساتھ نکلا۔ اس کے اڈیٹر منتخب ہوئے اور رسالے کو خوب ترقی دی چند اسباب کی بنا پر وہ ادیب سے الگ ہو کر زمانہ میں واپس آگئے۔ ۱۹۱۴ء میں نولکشور پریس لکھنؤ میں بسلسلۂ ملازمت چلے آئے اور اودھ اخبار نکالتے رہے اور آخر وقت تک اس سے متعلق رہے۔ نظرؔ نے ۸ ر اپریل ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔ محشرؔ لکھنوی نے تاریخ کہی۔

کلک محشرؔ نے لکھی سالِ وفات
شاعر کامل نظرؔ سے چھپ گیا

نظرؔ کی شہرت غزلیات کی بدولت ہے۔ ان کی غزلوں میں بندش کی چستی اور محاوروں کی خوبی بدرجہ اتم ہے، غزل کے اشعار صاف اور سادے ہوتے ہیں تاثیر کے ساتھ معنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے کلام کی پختگی کے ساتھ ساتھ جدت طرازی بھی ہے فارسی و عربی کے شیریں و ملائم الفاظ و محاورات سے شعر کے حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ انھوں نے مستقل نظمیں بھی کہی ہیں مگر اس میں وہ خوبی نہیں پیدا کر سکے جو غزل میں

پائی جاتی ہے جہاں کہیں نظموں میں تغزل کی چاشنی پیدا کر دی ہے ان میں تاثیر موجود ہے متانت و سنجیدگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ بعض جگہ منظر نگاری بھی خوب کی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے :۔

موت سے کیا ساز کر رکھا ہے اس نے اے نظر — مدتیں گزریں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

ہر قدم پر ایک نالہ ہر قدم پر ایک آہ — زندگی کیا ایک شرح سخت جانی ہو گئی

دل سوزاں کو شمع کیا کہیے — اس کو حسرت، کہاں ہے جلنے کی

اک طبیعت کی اداسی کا اثر اتنا ہے — ساری دنیا نگہ یاس میں ویرانہ ہے

زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات — اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

نظر کا گداز دل، مرثیہ میں کمال دکھاتا ہے۔ اپنے نواسے کی موت پر بڑا دردناک مرثیہ لکھا۔ کس حسرت و یاس سے کہہ رہے ہیں۔

تمھو تمھو کہ اس اجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ — بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ

نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ — تمام عمر دل ناتواں ہے اور یہ داغ

فغان بلبل جاں دل کے پار ہوتی ہے — نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

پنڈت برج نرائن چکبست

۱۸۸۲ء — ۱۹۲۶ء

برج نرائن نام، خاندانی لقب چکبست تخلص کچھ نہیں رکھا، خود کہتے ہیں۔

ذکر کیوں کر آئے گا بزم شعرا میں اپنا — میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہ گار نہیں

چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی لکھنؤ ہی ان کا آبائی وطن تھا کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۰۵ء میں بی۔اے

پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں وکالت کی سند حاصل کی اور اس کے بعد پریکٹس کرنے لگے سنہ ۱۹۲۶ء
کی بارہ فروری کو ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں رائے بریلی گئے اور لکھنؤ واپس
ہونے کے لئے اسٹیشن تک آرہے تھے کہ فالج گرا زبان بند ہوگئی اور چند ہی گھنٹوں میں انتقال
ہوگیا۔ محشر لکھنوی نے ان ہی کے ایک مصرع سے تاریخ وفات کہی۔

ان کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا　　موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست نے بچپن ہی سے شعروشاعری شروع کردی انیسؔ و آتشؔ کے دلدادہ تھے
فارسی اور انگریزی کا مطالعہ وسیع تھا۔ چکبست کے سینے میں دردمند دل تھا ملک و قوم
کی زبوں حالی سے ان کا دل روتا بھی تھا اور اس کے دُور کرنے کی جدوجہد بھی کرتا تھا۔
چکبست کا کلام قومی شاعری کا اعلےٰ نمونہ ہے ان کے یہاں قدیم و جدید رنگ کی آمیزش
پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری یہاں تک کہ غزلیں بھی حب وطن، قومی بیداری، جذبہ آزادی
اور فرقہ وارانہ اتحاد کے جذبات سے پُر ہیں۔ غزل کے علاوہ قومی، اصلاحی، تاریخی
اور نیچرل نظمیں بھی لکھی ہیں۔ متعدد قومی لیڈروں کی وفات پر دلگداز مرثیے کہے
رامائن کے قصے کو بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات بہت
کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں وہ بہت خوب ہیں۔ قدرتی مناظر کی حسین اور دلکش پیرایہ میں
تصویر کشی، کلام کی خوبی، خیالات کی پاکیزگی ان کی شہرت اور بقا کی ضامن ہے
غزلوں میں بندش کی چستی، صحت الفاظ، سلاست، اثر اور پختگی موجود ہے، انھوں
نے نیا مسلک اور نیا رنگ سخن ایجاد کرکے عروس شعر کو قید و بند سے آزاد کیا اس لئے
ان کی غزلوں میں دور جدید کی جملہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

چکبست کا مجموعہ کلام 'صبح وطن' کے نام سے شائع ہوچکا ہے، مثنوی گلزار نسیم
کے سلسلے میں شرر سے ان کا قلمی مباحثہ بھی بہت مشہور ہے 'صبح امید' کے نام سے

ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا غرض انھوں نے اپنی پوری زندگی ادبی فضا میں گزاری۔

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں
وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

اک طرف جان ہے پیمان وفا ایک طرف
امتحان آج ترا ہمت مردانہ ہے

چکبست کی مذہبی، سوشل اور نیچرل نظمیں بہترین ہیں۔ گائے کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں
چشمۂ فیض خدا مردِ خدا کہتے ہیں

دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں
ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منھ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

شاد عظیم آبادی

۱۸۴۶ء / ۱۲۶۳ھ - ۱۹۲۷ء / ۱۳۴۵ھ

نام سید علی محمد، تخلص شاد، خطاب خان بہادر، ۱۸۴۶ء / ۱۲۶۳ھ میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ عربی، فارسی، فقہ اور ادب تاریخ کے درس مختلف اساتذہ سے لئے۔ شاد کو آغاز شباب ہی سے ذوقِ شاعری تھا، سید شاہ الفت حسین فریاد سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ساری عمر شعر و سخن کی خدمت میں صرف کر دی۔ ۷ر جنوری ۱۹۲۷ء کو اس فخرِ اُردو کا انتقال ہو گیا۔

شاد نے غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ اور سلام ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اور ہر ایک میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے، خصوصًا غزل میں وہ مخصوص رنگ کے مالک ہیں۔ میر کی قنوطیت، درد کا تصوف، غالب کی بلند نظری اور آتش کی بے نیازی نے مل کر شاد کے کلام میں بلا کی کشش اور تاثیر پیدا کر دی ہے۔ شاد کے یہاں لکھنوی اور دہلوی رنگ سخن کی آمیزش ہے، صنائع بدائع کے ساتھ ساتھ سادگی و پُرکاری ہے، تغزل میں متانت و خودداری ہے، رباعیات و قطعات میں اخلاق و فلسفہ کا عنصر ہے۔ روزمرہ و محاورہ کی چاشنی، شیریں اور عام فہم الفاظ کا استعمال، کلام میں دلکشی و رعنائی پختگی و توانائی پیدا کرتا ہے، شاد نے خارجی اوصاف کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حضرت شاد نہایت زود گو اور پُرگو شاعر تھے، ان کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، تقریبًا پچاس تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:۔ مادر ہند، نالۂ شاد، ثمرۂ زندگی، فغان دلکش، چشمۂ کوثر، میخانۂ الہام، فکر بلیغ، سروش ہستی، فروغ ہستی، رباعیات شاد، مراثی شاد (دو جلد) صوبۂ بہار کی تاریخ (تین جلد) حیات فریاد وغیرہ۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے شاد کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوبؑ اے ساقی
خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آوے گا

پھر گئے رستہ سے وہ گرد و غبار دیکھ کر
رہ گئی میری بے کسی سوئے مزار دیکھ کر

اے ہم نفسو دم لینے دو وہ بھولے نغمے یاد آئیں
آئے ہیں چمن میں اڑ کے ابھی چھوٹے ہیں ابھی ہم دام سے ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہونچتے ہیں دو اک

اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

غنچوں کے مسکرانے پہ کہتے ہیں ہنس کے پھول
اپنا کرو خیال ہماری تو کٹ گئی

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
اس پر کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

ہزار نقشِ قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی

شوق قدوائی

۱۸۵۳ء - ۱۹۲۸ء

نام شیخ احمد علی، تخلص شوق، وطن قصبۂ جگور، ضلع بارہ بنکی ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں منشی مظفر علی آسیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے، لکھنؤ سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔ لیکن بعد میں بھوپال اور اس کے بعد رام پور میں ملازم ہو گئے۔ رامپور میں حامد اللغات، کی تدوین کا کام انھیں کے سپرد کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں انتقال ہو گیا۔

شوق کو ڈرامہ نگاری اور مثنوی نگاری سے انتہائی شوق تھا۔ انھوں نے لکھنؤ کے قدیم رنگ سخن کو چھوڑ کر نہایت پاکیزہ اور نیچرل نظمیں کہی ہیں، غزل میں وہ دہلوی طرز کے پیرو ہیں، انھیں جذبات نگاری میں کمال حاصل تھا، اس سلسلے میں ان کی نظم عالم خیال شاہکار ہے۔ اس طویل نظم میں اضافت کہیں نہیں نظر آتی۔

زبان نہایت سلیس، سادہ، عام فہم، بامحاورہ اور رواں ہے، لکھنوی روزمرہ

اور محاورہ کی چاشنی ہے۔ ان کا انداز بیان مثنویوں کے لئے موزوں ہے ان کے یہاں حقیقت نگاری کے عنصر بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے جذبات کی عکاسی بڑی دلکشی اور خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔

انھوں نے ایک طویل نظم لکھی جس میں سائنس اور مذہب کے مسائل نظم کئے ان کی بعض مثنویاں بہت مشہور ہیں۔ ڈرامہ قاسم و زہرہ۔ مثنوی ترانۂ شوق اور عالم خیال، شوق کی بہترین تصانیف ہیں۔

عالم خیال کے چند اشعار:۔

آج ادھر سے خیال تو کہاں کہاں گیا — دل بھی تیرے ساتھ تھا تو جہاں جہاں گیا
تو نے رُخ بدھر کیا دل کا رُخ اُدھر پھرا — تو پھرا جو پاس سے دل بھر آیا سر پھرا
جونک بن کے رات دن چوستا ہے غم لہو — زرد ہو گیا بدن رہ گیا ہے کم لہو
یا تو مجھ سے چھین لے ان کی یاد اے خدا — یا تو ان کو لا کے کر مجھ کو شاد اے خدا

ایک اور مثنوی کے چند اشعار:۔

رُخ برگ نہیں ہے زرد کیوں ہے — دل برف نہیں ہے سرد کیوں ہے
چہرے پہ غبار چھا گیا کیوں — آئینے پہ زنگ آ گیا کیوں
برسے گا اگر گھرا ہے بادل — پھولا ہے شجر تو لائے گا پھل
غنچہ ہے تو ہو گا پھول کر گُل — سُلجھے گی اُلجھ گئی جو کاکُل

سلیم پانی پتی

۱۸۶۷ء - ۱۹۲۸ء

مولوی وحیدالدین سلیم ابن مولوی فریدالدین پانی پت میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے عربی کی تعلیم پائی مولانا عبدالواحد سے تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفہ کا درس لیا۔ جالندھر کے ایک طبیب سے طب بھی پڑھی تھی، انگریزی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا، ایجرٹن کالج بھاولپور میں چھ سال ملازمت کرنے کے بعد رام پور کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی مقرر ہوئے پھر سرسید کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے اس کے بعد لاہور جا کر روزنامہ زمیندار کے ادارہ تحریر میں وابستگی اختیار کی اخبار بند ہونے کے بعد لکھنؤ چلے آئے اور مسلم گزٹ نامی اخبار جاری کیا اس کے بعد سر راس مسعود نے حیدرآباد دکن بلا بھیجا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا۔ وہاں دارالترجمہ میں ترجمہ کرنے کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۲۹ر جولائی ۱۹۲۸ء کو فتح آباد میں وفات پائی۔ سلیم پانی پتی نثر بھی لکھتے تھے اور اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ نثر میں وضع اصطلاحات اور افادات سلیم یادگار ہیں اور کلام کا مجموعہ افکار سلیم کے نام سے اسماعیل پانی پتی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

سلیم کی شاعری میں فکر و نظر کی گہرائی اور حرکت و عمل کی دعوت ہے۔ اعلیٰ جذبات و خیالات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرنا ان کی شاعری کا کمال ہے ان کا تجربہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ غزلوں میں حسن و عشق کی رنگینی موجود ہے۔

لیکن ان کی نظمیں بہترین ہیں۔ اپنی نثر و نظم کے متعلق ان کا یہ دعوے صحیح ہے۔

نظم میں زمزمہ کرتی ہیں امنگیں میری نثر میں ناچتی پھرتی ہیں ترنگیں میری

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

اُمنگوں نے کیا ہے زندگی کو میری طولانی

نہ پہلو میں یہ دل ہوتا تو قصہ مختصر ہوتا

نہ میری کشتی کو چھو سکے گا یہ تیرے قہر و غضب کا طوفاں

کہو سمندر کی موج سے تم عبث ہے یہ اضطراب تیرا

دیدۂ بیدار میں انجم سے لے کر مستعار

دیکھتا ہوں شاہد قدرت کی بزم آرائیاں

خوشی کو کیوں رنج و غم سے بدلو بہار کو کیوں خزاں بناؤ

کلی کھلی ہو اگر نہ دل کی نہ جاؤ پھولوں کی انجمن میں

الٰہی یہ زندگی کی منزل، سکونِ دل سے ہو کس طرح طے

کہ پہرہ دینے کو ہر قدم پر بٹھا دیئے انقلاب تونے

پیغامِ حیات کا آخری بند

چڑھتے ہوئے دریائے خطر سے ہی اُترنا طوفان حوادث کے تھپیڑوں سے نہ ڈرنا

چوٹوں سے تمھیں دستِ قضا کی ہی گزرنا دب دب کے پڑے گا تمھیں ہر بار اُبھرنا

گرما و جو غیرت ہے تو ہرگز نہ ٹھٹھرنا

الفت ہے جو سمٹو تو سمٹ کر نہ بکھرنا

نظم طباطبائی

سنہ ۱۸۵۲ء - سنہ ۱۹۳۳ء

نام سید علی حیدر، تخلص نظم، خطاب نواب حیدر یار جنگ، والد کا نام میر مصطفیٰ حسن طباطبائی تھا، ۱۶ر صفر سنہ ۱۲۷۰ھ م سنہ ۱۸۵۳ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم ہیں حاصل کی سولہ سال کی عمر تک ملا طاہر نجومی سے عربی و فارسی صرف و نحو پڑھی۔ ان ہی دنوں منشی مینڈو لال زار سے علوم متداولہ اور فن شاعری کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ خاتم الدین سے درس نظامی کا نصاب پڑھا۔ شہزادہ کام بخش کے معلم کی حیثیت سے مٹیا برج گئے۔

سنہ ۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد میر فضل حسین صاحب مجلس عدالت العالیہ کی تحریک سے حیدرآباد دکن گئے اور کتب خانہ آصفیہ کے معتمد مقرر ہو گئے اس کے بعد نظام کالج کے پروفیسر منتخب ہو گئے اور تقریباً تیس سال تک کالج میں رہے کچھ عرصہ شاہزادگان نظام کے استاد رہے اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ناظر ادبی مقرر ہوئے، ۲۳ر مئی سنہ ۱۹۳۳ء کو اس قابل قدر ہستی کی خدمات سے اردو ادب ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

طباطبائی کی ذات فضل و کمال کے لحاظ سے یکتا تھی اگرچہ پرانے خیالات کے آدمی تھے لیکن مغربی خیالات و ادب سے متاثر ہو کر جدید قسم کی نظموں میں وہ نام پیدا کیا کہ گھر گھر شہرت ہو گئی۔ ٹامس گرے کی مشہور نظم کا ترجمہ گور غریباں اس خوبی سے کیا کہ آج تک اس کی مثل نہیں۔ نظم نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں مثلاً مناظر قدرت، اخلاقیات اور تاریخ وغیرہ ان کے کلام میں روانی اور نشست الفاظ کی وجہ سے ترنم پایا جاتا ہے، تشبیہات میں ندرت، و شگفتگی ہے۔ نظم نے اردو ادب میں

نظموں کے ترجمہ کرنے والوں کی خاص رہنمائی کی اور انھوں نے قصیدوں کو ایک نئی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا ان میں تاریخی عنصر کا اضافہ کیا۔ غزلوں میں نہ توجذبات کی شدت ہے، نہ تغزل اور آمد، اکثر غزلیں صرف قافیہ پیمائی کا نمونہ ہیں جن میں تاثیر کی کمی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب میں نظم کا ایک خاص مقام ہے۔ نظم متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، شرح دیوان غالب، شرح امرار القیس، صوت تغزل یا دیوان طبا طبائی انکی خاص تصانیف ہیں۔ نظم کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد ان کا دیوان شائع ہوا، اس دیوان میں زیادہ تر غزلیں چند رباعیاں اور تاریخیں ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

تجھے یکتا سمجھ کر نازِ یکتائی اٹھاتا ہوں

دگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا

قدم سے طاقتِ رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہ کر

میں اب جھک جھک کے چلتا ہوں کہ سُن لوں کیا جواب آیا

نہ جانے کس بیاباں مرگ نے مٹی نہیں پائی

بگولے جارہے ہیں کارواں در کارواں ہوکر

جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا | باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی

گورِ غریباں کا آخری بند

اب آغوشِ لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا | گیا افسوس لیکن یہ جواں ناکام دنیا سے

دکھایا جاہ و شہرت نے نہ بھولے سے کبھی منھ اپنا | پھر ایسے نامرادوں کو بھلا کیا کام دنیا سے

ڈاکٹر سر محمد اقبال

۱۸۷۳ء۔ ۱۹۳۸ء

شاعر مشرق، شیخ محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء میں بمقام سیال کوٹ پیدا ہوئے، ابتدا میں عربی فارسی پڑھی، اس کے بعد سیال کوٹ اور لاہور میں انگریزی کی اعلیٰ ڈگریاں اعزاز کے ساتھ حاصل کیں۔ کچھ عرصہ کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہوگئے۔ اس کے بعد ولایت تشریف لے گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری لی۔ جرمنی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی اور لندن میں بیرسٹری پاس کر کے ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آکر وکالت کرنے لگے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے وفات پائی، اور لاہور میں شاہی مسجد کے پاس دفن کئے گئے۔

اقبال بچپن ہی سے عروس سخن کے گیسو سنوارنے لگے تھے، مرزا داغ سے استفادہ کیا۔ شاعری میں اقبال کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ تخیّل کی عظمت، نظر کی وسعت، فکر کی رفعت اور حقیقت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زور و اثر اتنا ہے کہ کوئی دوسرا شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے۔ میر کا سوز و گداز، درد کی تاثیر و دلآویزی، غالب کی جدت و نکتہ آفرینی، مومن کی نازک خیالی، ذوق کی روانی، شیکسپیر کی فطرت نگاری، ملٹن کی پرواز فکر، شیلی کی شیریں کلامی، نٹشے کی حکمت شعاری یہ سب کلام اقبال میں جمع ہوگئی ہیں۔ اقبال نے مشرقی و مغربی علوم و فنون اور دنیا کے مشاہیر اساتذہ کے خیالات سے استفادہ کیا۔ اردو شاعری میں وہ آزاد، حالی اور اکبر کے سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔

اقبال کی شاعری کے چار دور کئے جا سکتے ہیں۔

پہلا دور } سفر انگلستان ۱۹۰۵ء سے پہلے کا ہے۔ اس دور میں ان کا کلام
۱۹۰۵ء تک } قومیت اور وطنیت کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ داغ کی اصلاح
نے زبان کی صفائی و سلاست کی طرف زیادہ متوجہ کیا۔

دوسرا دور } قیام یورپ (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۰۸ء) کا ہے۔ یورپ کی سیاست کا
۱۹۰۵ء۔ ۱۹۰۸ } بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کے ہولناک اور انسانیت سوز
نتائج سے اقبال واقف ہوئے، جغرافیائی وطنیت کو انسانیت کے لئے سب سے
زیادہ تباہ کن پایا، انھوں نے انسانیت کا اعلیٰ تصور اسلام میں پایا اور اسلامی
اخوت، مساوات، خودی، عزت نفس، رواداری اور جذبۂ عمل کے پیامبر بنے اور
مرد مومن کا تصور پیش کیا۔

تیسرا دور } یورپ سے واپسی کے بعد ایک فلسفی، مفکر اور حکیم کی حیثیت سے
۱۹۰۸ء۔ ۲۴ } اقبال نے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا۔ خودی کے داعی بنے، حرکت
و زندگی کا پیام دیا وطنیت اور قومیت کی محدود فضاؤں سے نکل کر عالمگیر اخوت
و مساوات کا درس دیا۔ اپنے احساسات و خیالات جذبات اور رجحانات کو ادا کرنے کیلئے
فارسی زبان کو ذریعہ بنایا۔

چوتھا دور } درحقیقت دور سوم کی تکمیل اسی دور میں ہوتی ہے۔ نوجوانان
۱۹۲۴ء۔ ۳۸ } ملک کو مادہ پرستی اور مغربی تہذیب تمدن کے معائب سے
آگاہ کرنے کے بعد اخوت و مساوات، عزم و حوصلہ، حریت و عمل اور خودی و خود
اعتمادی کے جذبات بیدار کئے۔

اقبال کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت کاملہ حاصل تھی اور
دونوں زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے۔

پہلے دوسرے دور کا کلام بانگ درا میں شامل ہے۔

تیسرے دور میں۔ اسرار خودی، رموز بیخودی اور پیام مشرق۔ اور چوتھے دور میں۔ بالِ جبرئیل، ضربِ کلیم، زبورِ عجم، جاوید نامہ، ارمغان حجاز جیسی مایۂ ناز کتابیں لکھیں۔

اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ کلیات اقبال کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اقبال کی غزلوں میں بھی دورِ جدید کی جملہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جن میں تاثیر، روانی، تبحر، رنگینی، شگفتگی، فلسفیانہ مسائل سب کچھ موجود ہیں۔

اقبال کے کلام میں رفعت تخیل، حسنِ ادا، جوش بیان، سوز و گداز، گہرائی و گیرائی، جدید تراکیب، فلسفیانہ انداز، شوخی و رنگینی، موسیقیت، ترنم، سلاست و روانی مصوری، نادر تشبیہات و استعارے بدرجہ اتم موجود ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ملے رہرو فرزانہ، رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

طالب علم سے خطاب

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

جائزہ

جدید شاعری نے اُردو شعر و ادب میں زندگی و توانائی پیدا کی، اسے متحرک اور باعمل بنایا اس کو وسعت اور گہرائی عطا کی زبان کے اعتبار سے بھی اور خیالات کے اعتبار سے بھی اُردو ادب میں کافی اضافہ ہوا، مغربی خیالات و نظریات کو اپنا کر شاعری میں تنوع پیدا کیا گیا، عصری رجحانات کی ترجمانی کی گئی اور افادی پہلو کو زیادہ پیش نظر رکھا گیا۔ شاعری صرف دل بہلاوے ہی کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ اس سے تعمیری کام بھی لئے گئے، اس کو قوم کی پستی اور بدحالی کو دور کرنے کا وسیلہ بنایا گیا اور ہر قسم کی اصلاحی کوششیں اس کے ذریعے کی گئیں ہر موضوع پر خواہ وہ سیاسی ہو یا تعلیمی، سماجی ہو یا مذہبی، اظہار خیال کیا گیا۔ غرض شاعری نے جدید نظریات قبول کر کے اپنے اندر وسعت بھی پیدا کی اور افادیت بھی۔

اس دور میں غزل گوئی پر سب سے زیادہ زوال آیا لیکن سخت مخالفت کے باوجود یہ صنف سخن مٹ نہیں سکی۔ اور دلوں کے اندر اس کا اثر بدستور قائم

رہا البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے مضامین صرف حسن و عشق ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ دوسرے موضوع بھی بیان کئے جانے لگے، نیچرل شاعری کا سب سے زیادہ رواج ہوا اور نیچرل مضامین مثنوی، مسدس وغیرہ میں بیان کئے جانے لگے، نیچرل مثنویاں بھی زیادہ لکھی گئیں، قطعات اور رباعیات کی طرف بھی زیادہ توجہ دی گئی۔ مرثیے واقعات کربلا ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ قومی، ملکی اور شخصی مرثیے بھی لکھے جانے لگے، مسدس میں ہر قسم کے خیالات ادا کئے گئے، حالی نے ترکیب بند ترجیع بند اور قطعات کی طرف زیادہ توجہ دی اور کچھ شعرا نے ان کی پیروی بھی کی مگر یہ صنف سب کے بس کی بات نہیں تھی اس لئے زیادہ رواج نہیں پا سکی۔

آزاد اور معریٰ نظمیں بھی لکھی گئیں مگر وہ بھی زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں بحیثیت مجموعی جدید شعرا نے اردو زبان و ادب کی ناقابل فراموش خدمت کی اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ اپنے خونِ جگر سے چمنستان سخن کی آبیاری نہ کرتے تو اس کے اجڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ درحقیقت یہ دور اردو شعر و ادب کے احیار کا دور ہے۔

(۲)

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۱ء

مولانا محمد علی جوہر، رام پور میں پیدا ہوئے، دو برس کی عمر میں پدر بزرگوار مولوی عبدالعلی کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے تعلیم و تربیت کی ابتدائی اور دینی تعلیم رام پور اور بریلی میں حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی، اے پاس کیا۔ اس کے بعد انگلستان جاکر آکسفورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۹ء میں واپس آئے اور مختلف جگہوں پر ملازمت کی۔ ۱۹۱۱ء سے کامریڈ جاری کیا، اس کے بعد اردو میں ہمدرد نکالا۔ قوم و ملک کے سچے خادم اور آزادی ہند کے فدائی تھے قید و بند کی سختیاں جھیلیں مگر

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

کے بمصداق محمد علی کا جذبۂ حریت انگریز کی سنگینیں دبا نہ سکیں، یہاں تک کہ محمد علی نے غلام ملک میں مرنا بھی پسند نہیں کیا، ولایت میں گول میز کانفرنس کے موقع پر ان کی یہ آرزو پوری ہوگئی۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو وہیں شمع آزادی کا یہ پروانہ اللہ کو پیارا ہوگیا۔ مرنے کے بعد جگہ بیت المقدس میں پائی۔

میدان سیاست کا یہ شہسوار، اسلامیت و انسانیت کا یہ علمبردار، شعر و سخن کا بھی دلدادہ تھا، انشا پردازی و صحافت میں اس کا جواب نہیں تھا، ہمدردی و انسانیت کا دوسرا نام محمد علی تھا، کلام میں سوز و گداز، درد اور اثر، سچائی اور تڑپ، روانی اور جوش، فصاحت و بلاغت بدرجہ اتم ہے۔ غزلیں حب وطن کے

نغموں اور مذہب و ملت کے راگوں کا مجموعہ ہیں، کلام کم ہے لیکن جو کچھ ہے انتخاب ہے، اس میں آمد ہی آمد ہے، آورد نام کو نہیں۔

مضامین اور کلام کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

خوش قسمتی کے آگے جھکایا نہ سر کبھی ۔ اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ۔ ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر ۔ ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

کیا ڈھونڈتے ہو فصل خزاں میں بہار کو ۔ اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگ چمن کہاں

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو ۔ بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ ۔ دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اب بھی اتنا اثر ہے نالہ میں ۔ حشر میں حشر اک بپا کر دے

ریاض خیرآبادی

۱۸۵۳ء - ۱۹۳۴ء

سید ریاض احمد ریاض کے والد کا نام مولوی طفیل احمد تھا، ۱۸۵۳ء میں بمقام خیرآباد ضلع سیتاپور پیدا ہوئے، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی، بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی، امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ استاد کی شفقت اور توجہ نے ریاض کو بہت جلد باکمال بنا دیا۔ عمر بھر شعر و ادب و صحافت کی خدمت کرتے رہے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء کو وفات پائی۔

ریاض مخلص، باکمال اور پابند مذہب انسان تھے، شوخی فطرت تھی، زبان و ادب سے عشق تھا۔ متعدد رسائل و اخبارات لمع رخشاں، ریاض الاخبار، فتنہ،

عطر فتنہ، نکالے۔ انگریزی ناولوں کا ترجمہ حرم سرا، اور نظارہ کے نام سے کیا۔ کلام کا مجموعہ "ریاض رضوان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

شوخی و رنگینی، مستی و سرشاری ریاض کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں، خمریاتی شاعری نے ریاض کو خیام الہند بنا دیا۔ زبان حوض کوثر سے دُھلی ہوئی ہے جس میں روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی موجود ہے۔

رنگ تغزل :-

بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم
لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

ہم تھک کے گرے گر کے اُٹھے، اُٹھ کے چلے بھی
تجھ پر اثر اے دوریٔ منزل نہیں ہوتا

باغباں دل میں بھری ہیں تری باتیں کیا کیا
آشیاں جل کے کہیں اور بنا لوں تو کہوں

بڑے پاک باطن، بڑے صاف طینت
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

نہ شبستاں ہے نہ اب شمع شبستاں کوئی
گھر کا یہ حال ہے جیسے ہو بیاباں کوئی

تمنائیں بہت ہیں وقت کم ہے
کسے دیکھوں نگاہِ واپسیں ہے

خمریات ریاض :- ریاض کا مخصوص رنگ ہے۔

پی پی کے اس نے تہجد کے لئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

جامِ مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جہاں ہم خشت خم رکھ دیں بنا کعبہ کی پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

رواں

۱۸۸۹ء - ۱۹۳۴ء

چودھری جگت موہن لال نام، رواں تخلص تھا، ۱۸۸۹ء میں بمقام اناؤ پیدا ہوئے

بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ اپنی خداداد ذہانت اور بھائی کی سرپرستی کی وجہ سے ایم اے ایل ایل بی کر کے وکالت شروع کی اور بہت جلد مشہور و ممتاز ہو گئے لیکن عمر نے وفا نہ کی اکتوبر ۱۹۴۳ء میں رواں اناؤ کی قانونی و ادبی مجلس کو سونی کر گئے۔

ذوق شاعری ابتدا ہی سے تھا عزیز لکھنوی کی شاگردی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر رباعیات میں اپنے لئے ممتاز جگہ پیدا کر لی زندگی کے گہرے مسائل، فلسفۂ اخلاق اور بے ثباتیٔ دنیا کو رواں نے رباعیوں میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ سلاست و متانت، گہرائی و گیرائی، تشبیہات و استعارات کا حسب موقع استعمال، قابل تعریف ہے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی نے اردو مرکز کی طرف سے ان کی رباعیات کا مجموعہ شائع کیا ہے۔

انسان کو ایسا بھی کور و غافل کیا ہو
محدود نظر ہو ہر طرف پردا ہو
یہ دور حیات خواب غفلت ہے رواں
بیدار ہوں ہم تو دیدۂ دل وا ہو

اسباب جہاں سے دل کو بہلائیں ہم
اس طرح کا دل بھلا کہاں پائیں ہم
خلوت میں بھی حیف دل کو ایذا ہی رہی
اب اپنے سے بھاگ کر کہاں جائیں ہم

ہے چشم حواس کور آفت یہ ہے
ہم رہرووں کو رنج غربت یہ ہے
آئے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں
اس کی بھی خبر نہیں مصیبت یہ ہے
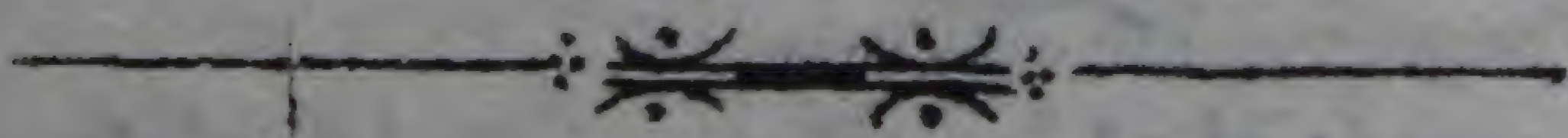
عزیز لکھنوی

۱۸۸۲ء — ۱۹۳۵ء

مرزا محمد ہادی عزیز، مرزا محمد علی کے بیٹے تھے، جد امجد شیراز سے کشمیر اور کشمیر سے لکھنؤ آئے۔ عزیز کی ولادت یہیں ۱۸۸۲ء میں ہوئی، بچپن ہی سے سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ درسیات فارسی کی تکمیل کر کے عربی پڑھی، حصول علم کا شوق آخر وقت تک رہا، شاعری میں حضرت صفی کے شاگرد ہو رہے۔ فطری شوق اور کثرت مشق نے شہید جلوۂ معنی، بنا دیا۔ اکبر نے سچ کہا۔

سخن میں اور تو اہل تمیز ہی ہیں فقط — شہید جلوۂ معنی عزیز ہی ہیں فقط

عزیز نے غزل میں نیا آب و رنگ پیدا کیا۔ سوز و گداز، خیال آفرینی، مشکل پسندی، معنی آفرینی، دہلوی طرز کی سادگی و دلکشی، وسعت مضمون، لطافت تخئیل، جذبات بیان اور کیف و ترنم عزیز کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

عزیز نے قصائد میں بھی نیا انداز اختیار کیا، شکوہ الفاظ، علوئے تخئیل، ندرت بیان کے ساتھ ساتھ مسلسل نظم کی بہت سی خوبیاں قصائد میں پائی جاتی ہیں۔

کلام عزیز لسانی و معنوی دونوں حیثیتوں سے رکاکت سے پاک ہے۔ "گلکدہ" اور "قصائد ولا" عزیز کی یادگار ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

بہت ہنس رہے تھے رُلا ہی دیا — اُنھیں زخم دل کا دکھا ہی دیا

اے جستجو میں اس کی سرگرم رہنے والے — گو راہ پُر خطر ہے لیکن کبھی نہ ڈرنا

معجزہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں — مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

مست ہیں اپنے خیالات جنوں خیز میں ہم — روز دنیا نئی آباد کیا کرتے ہیں

ولے دیوانگی شوق کہ پھر بھی نہیں چین — جانتا ہوں جو نکل جائے وہ ارماں کیوں ہو

اصغر گونڈوی

۱۸۸۴ء - ۱۹۳۶ء

مولانا اصغر حسین نام تخلص اصغر ضلع گورکھپور میں یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے زمانہ دراز تک گونڈہ کی سکونت نے گونڈوی بنا دیا ابتدائی تعلیم معمولی تھی ذاتی مطالعہ سے عربی، فارسی، انگریزی میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی، ۱۹۲۲ء میں لاہور بھی گئے اور تاجور کے اردو مرکز کے مہتمم مقرر ہوئے، پھر یگانہ چنگیزی سے مخالفت ہو جانے کی وجہ سے گونڈہ واپس آگئے۔ کچھ دنوں انڈین پریس الہ آباد سے بھی تعلق رہے اور ہندستانی اکیڈمی کے ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے ادارتی فرائض انجام دیتے رہے۔ اصغر بڑے خوش ذوق اور با اخلاق بزرگ تھے۔ اپنے حلقہ احباب میں صاحب حال و قال صوفی سمجھے جاتے تھے۔

اصغر کو ذوق شاعری ابتدا ہی سے تھا اس میں بھی مذاق سلیم نے ان کی رہنمائی کی اگرچہ گوشہ نشینی اور خاکساری کی وجہ سے شہرت سے دور رہے لیکن ان کے کلام میں بلا کی لطافت و پاکیزگی اور رفعت خیال پائی جاتی ہے۔ اصغر کا رنگ منفرد ہے حسن و عشق کے باہمی تعلق پر مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی ہے ان کی شاعری رجائیت، شگفتگی، رنگینی، مفکرانہ گہرائی، بلند ہمتی، عارفانہ سوز و گداز کا مجموعہ ہے انھوں نے بیشتر حقائق تصوف اور فلسفہ کے نکات کو نئے انداز سے بیان کیا ہے۔ اسرار حقیقت کو ہر نغمہ رنگین اور شاہد زیبا سے معلوم کیا، غزل میں بتوں کے حسن اور شراب کی مستی کی طرح موج زندگی بخشی ان کی نظر درد ہجر، لذت وصال سے زیادہ بلند تھی، غرض ان کے یہاں بلند ترین شاعری کے بہترین نمونے ہیں، ان کے رجائی اور شگفتہ نغمے اردو شاعری کی محرومی اور

اُداسی کو خوشگوار بناتے ہیں۔

اصغر کی غزلوں کے مجموعے "نشاطِ روح" مطبوعہ ۱۹۲۵ء اور "سرودِ زندگی" مطبوعہ ۱۹۳۵ء تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم دیا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

روداد چمن اس طرح سنتا ہوں قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

میری نالۂ درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لیے ہوئے

وہ نغمۂ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

رند جو ظرف اُٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہیں میخانہ بنے

فانی

۱۸۷۹ء۔۱۹۴۱ء

نام محمد شوکت علی خاں، تخلص ابتدا میں شوکت اور پھر فانی اختیار کیا، والد کا نام محمد شجاعت علی خاں رئیس بدایوں۔ فانی ۱۳ر ستمبر ۱۸۷۹ء بمقام قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد سب انسپکٹر پولیس تھے۔ فانی نے آٹھ نو سال کی عمر تک عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے ۱۸۹۷ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۱ء میں بریلی سے بی اے کی ڈگری لی اس کے بعد وزیر آباد ہائی اسکول میں مدرس ہوئے پھر اسلامیہ ہائی اسکول میں تقرر ہوا کچھ عرصہ بعد۔۔۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر گونڈہ پہونچے ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ

سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی ۱۹۱۳ء میں پٹنہ واپس چلے گئے ۱۹۳۱ء سے آگرہ سے رسالہ تسلیم جاری کیا ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن گئے لیکن بیماری کے باعث واپس آ گئے۔ تندرست ہونے پر آگرہ اور پھر وہاں سے حیدرآباد گئے۔ ۱۹۳۳ء تک سخت پریشانی کا عالم رہا اور کافی دنوں بعد دار الشفا ہائی اسکول بلدہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے جہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں رفیقہ حیات فوت ہو گئیں۔ ۱۹۳۳ء میں جوان سالی بیٹی بھی فوت ہوئی تھی جس سے فانی کے دل کو سخت چوٹیں لگی۔ آخر کار ساری زندگی ناکامیوں اور مایوسیوں میں بسر کر کے ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء میں انتقال فرمایا۔

فانی کو ابتدا سے شعر و سخن کا چسکا تھا، ان کا ذوق سلیم شاعری میں کسی رہبر کا مرہون منت نہیں، پہلے لکھنوی رنگ سے متاثر تھے۔ بعد میں دہلوی رنگ میں کہنے لگے ان کا پورا کلام حزن و یاس کا مرقع ہے۔ فانی کا فلسفہ حیات غم کا فلسفہ ہے۔ ان کا کلام سوز و گداز، یاس و محرومی، خستگی اور کسک، درد و اثر، بے چارگی اور قنوطیت کا مجموعہ ہے اس لئے ان کو یاسیات کا امام، ہیوۂ عالم، سوز خواں کہا جانے لگا، دقت فکر، عمق نگاہ، صداقت جذبات، تاثرات قلب اور مطالعہ نفسیات نے کلام فانی کو باقیات فانی بنا دیا ہے۔ فانی عصر حاضر کے حقیقی جذباتی اور دل کے شاعر ہیں۔

کلام فانی کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا جو کچھ بچا وہ دیوان فانی، باقیات فانی، وجدانیات فانی اور عرفانیات فانی کے ناموں سے شائع ہو چکا ہے۔ کلیات فانی جملہ کلام کا مجموعہ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:—

مزاج دہر میں اُن کا اشارہ پائے جا
جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

فکر وفائے عہد تمہاری بلا کرے
جیتا ہے کوئی وعدۂ صبر آزما کے بعد

وہ خود اسیر جمال ہے جو نظر تھی جلوۂ یار پر
مجھے اب بہار سے کیا غرض کہ مری خزاں ہی بہار پر

ترک تدبیر کو بھی دیکھ لیا
یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی

خاک وطن ہی راس نہ آئی غربت تو پھر غربت ہے

فانی اپنی خانہ بدوشی، خانہ خرابی کیا کہئے

بیداد پہ کہئے اُف نہ کریں کہئے تو تڑپ کر دم دیدیں

کچھ شغل ہمیں بھی آتے ہیں سرکار کا دل بہلانے کے

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر
کچھ امید جواب میں گزری

سائل

۱۸۶۷ء - ۱۹۴۵ء

نام نواب سراج الدین احمد خاں۔ سائل تخلص ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ شہاب الدین خاں ثاقب شاگرد مرزا غالب کے فرزند تھے اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں ان کے دادا کا نام تھا۔ ثاقب مرزا داغ دہلوی کے چچازاد بھائی تھے اور خود سائل داغ کے داماد تھے، اس طرح شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ سائل اور اُن کی بیگم کو ریاست حیدرآباد دکن سے وظیفہ ملتا تھا۔ موسیقی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ مشاعروں میں غزل لحن سے پڑھنے کا رواج انھیں کی ایجاد ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ۸۲ سال کی عمر میں عالم جاودانی کو لبیک کہا۔

سائل کو زبان پر قدرت کاملہ ہے۔ روزمرہ کی صفائی، محاوروں کی خوبی سلاست و روانی میں ان کا جواب نہیں۔ کلام میں شوخی و رنگینی، شگفتگی و پاکیزگی، عجب لطافت

پیدا کرتی ہے۔ انداز بیان شیریں و دلکش ہے۔ متبذل اور عامیانہ مضامین سے ان کا کلام پاک ہے۔

مومن کی طرح مقطع میں سائل بھی اپنا تخلص خوب کھپاتے ہیں۔

اہل محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں
بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

تمھارے تیر کا پیکاں نہیں نکلا مرے دل سے
اسی میں چاہیے ہونا ادھر دیکھو اُدھر دیکھو

غمگسار و مری توبہ کا بھرم سا کیا ہے
ابھی پی جاؤں اگر ضد سے پلادے کوئی

توبہ بھی کرنی پڑتی ہے پی کر اسے مدام
نام اس کا مے بھی ہے عرق انفعال بھی

ہمیں کہتی ہے دنیا زخم دل زخم جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے

جلیل

سنہ ۱۸۶۶ء - سنہ ۱۹۴۶ء
۱۲۸۳ھ - ۱۳۶۵ھ

حافظ جلیل حسن نام، جلیل تخلص، والد کا نام عبدالکریم مانک پور (اودھ) میں سنہ ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی۔ امیر مینائی کے تلامذہ میں شامل ہوئے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین قرار پائے۔

استاد کے فیض صحبت سے ان کی علمی لیاقت اور فنی مہارت میں چار چاند لگ گئے اسی زمانے میں سرکشن پرشاد شاؔد کے حکم سے محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی مرتب کیے اور ایک کتاب تاریخ نظام، حضرت امیر کے فرزند اختر مینائی کی معاونت سے ترتیب دے کر شائع کی۔ داغ کی وفات کے بعد نظام دکن کے اُستاد مقرر ہوئے اور جلیل القدر کا خطاب پایا، جلیل آخر وقت تک حیدرآباد میں رہے اور وہیں

جنوری ۱۹۴۶ء میں رحلت کی۔

جلیل ممتاز و بلند پایہ شاعر تھے ان کا کلام سادگی و بے ساختگی، شگفتگی و نغمگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ان کی شاعری رکاکت و ابتذال سے پاک ہے اور وہ مصنوعی تصوف نگاریوں اور تخئیلی موشگافیوں یا فلسفہ طرازیوں سے بھی بے تعلق رہے ان کی زبان صاف ستھری پاکیزہ اور انداز دلچسپ و شیریں ہے۔ جلیل کثیر التصانیف ہیں۔ نظم میں معراج سخن، سرتاج سخن، جان سخن، روح سخن، گل صد برگ۔ اور نثر میں اردو کا عروض، تذکیر و تانیث، معیار اردو، تعلیم الصلوٰۃ وغیرہ یادگار ہیں۔

کیا کریں گے میں اگر یاد آیا ۔۔۔ میرے آنے کی تو بندش ہے مگر
نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا ۔۔۔ یہ رنگ گلاب کی کلی کا
راتیں مگر گزرتی ہیں سوز و گداز میں ۔۔۔ میں شمع بزم ہوں نہ چراغ مزار ہوں
ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی ۔۔۔ اظہار حال پر مجھے قدرت نہیں رہی
یہ تو اپنا عمر بھر کا کام ہے ۔۔۔ آج آنسو تم نے پونچھے بھی تو کیا

اختر شیرانی

۱۹۰۵ء — ۱۹۴۸ء

محمد داؤد خاں نام، اختر تخلص۔ حافظ محمود خاں شیرانی مصنف "پنجاب میں اردو" کے صاحبزادے تھے، ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں تعلیم و تربیت ہوئی اور اورنٹیل کالج سے منشی فاضل، ادیب فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ابھی شباب کی منزلیں طے بھی نہ کرنے پائے تھے کہ فرشتۂ اجل نے اس ہونہار شاعر کو ہمیشہ کے لئے ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو سب سے جدا کر دیا۔

اختر شعر و شاعری سے فطری لگاؤ رکھتے تھے، بچپن ہی سے مشق سخن کرنے لگے۔

صابر علی خاں شاکر سے ابتدا میں مشورہ بھی کیا پھر فطری ذوق رہنما بنا۔ اختر خود بھی شوخ و رنگین تھے مناظر قدرت کے دلدادہ تھے۔ ہمدردی و اخلاص کے پیکر تھے اس لئے ان کے کلام میں بھی وہی خوبیاں ہیں وہ جذباتی شاعر تھے اور جذبات میں عشق و محبت کی شدت، اختر کے بیان صداقت پر مبنی ہے، اردو میں ہندی اور سنسکرت کے کھپ جانے والے الفاظ کی شمولیت جائز سمجھتے تھے، ردیف و قافیہ کی پابندی بہتر سمجھتے تھے۔ ان کی غزلوں سے زیادہ نظمیں مقبول ہیں، نظموں میں ایک خاص قسم کا کیف اور ترنم ہوتا ہے، ان کی رومانی نظمیں اپنے درد و اثر، کیف و سرور، سوز و گداز میں بے مثال ہیں۔

اختر کے کلام کا مجموعہ کلیات اختر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

گلزار جہاں میں گل کی طرح، گو شاد ہیں ہم شاداب ہیں ہم
کہتی ہے یہ ہنس کر صبح خزاں سب نازِ عبث اک خواب ہیں ہم

نہیں زندگی کو وفا ورنہ اختر — محبت سے دنیا کو معمور کر دوں

ہر مسرت ہے غم تازہ کی تمہید اے دل — نغمۂ شوق میں آثار فغاں دیکھتے ہیں

نہ ساز و مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہار چمن ہے باقی
نگاہ شمع سحر کے پردے پہ نقش ہر انجمن ہے باقی
غم زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبع اختر
نہ وہ نشاط کہن ہے باقی، نہ وہ مذاق سخن ہے باقی

صفؔی

۱۸۶۲ء - ۱۹۵۰ء

نام سید علی نقی تخلص صفؔی سید فضل حسین والد کا نام۔ لکھنؤ میں بتاریخ ۲ جنوری ۱۸۶۲ء
پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی، عربی و فارسی میں معقول استعداد حاصل کی اور
انگریزی ہائی اسکول تک پڑھی۔ محکمہ دیوانی میں تقرر ہوا، مختلف مقامات اور عہدوں
پر چالیس سال خدمت کرنے کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنشن ہو گئی۔ ۲۸ سال پنشن لینے کے
بعد ۱۹۵۰ء میں انتقال فرمایا۔ مولانا کو ذوق سخن بچپن سے تھا۔ فطری ذوق اور طبعی
مناسبت نے رہنمائی کی، جملہ اصناف سخن میں دستگاہ حاصل ہو گئی اور اساتذہ میں شمار
کئے جانے لگے، غزل گوئی کے علاوہ نظم نگاری میں بھی باکمال تھے، مولانا کی قومی،
مذہبی و تاریخی نظمیں، اخلاقی مثنویاں زیادہ مشہور رہیں، جن کی بدولت قوم نے
لسان القوم تسلیم کیا۔ غزل اور نظم دونوں سے مہارت فن اور قدرت زبان کا
اظہار ہوتا ہے۔ روزمرہ محاورات اور تشبیہات کا لطف بھی ہر جگہ ملتا ہے، فلسفہ
زندگی اور عاشقانہ مضامین کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ درد داغ اور سوز و
گداز کافی ہے۔ کلام صفؔی کی اشاعت و طباعت کے لئے "صفی اکیڈمی" قائم
ہوئی جس نے دیوان صفی شائع کیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ۔۔۔ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

ہے اختلاف وحدت و کثرت نمائشی ۔۔۔ دریا ہے موج، موج سے دریا جدا نہیں

پابند نہیں جلوۂ آزاد مکاں کا ۔۔۔ یکساں ہے صفؔی دیر و حرم اپنی نظر میں

بلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہہ دو ۔۔۔ بستر گل پہ کوئی خواب گہ ناز میں ہے

دل میں رکھوں تو کدورت کہلائے — منھ سے نکلے تو شکایت ہوگی

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

دیر اسی کو جانیے کعبہ اسی کو جانیے
پوجیے وہ دل جسے ہمدرد انساں دیکھیے

آرزو

۱۸۷۳ء — ۱۹۵۱ء

نام سید انور حسین، عرفیت منجھو صاحب، تخلص پہلے امید، پھر آرزو اختیار کیا، میر ذاکر حسین یاس کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۷۲ء ۱۲۸۹ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال فرمایا۔

آرزو کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا، ۱۳ سال کی عمر میں جلال لکھنوی کے شاگرد ہوئے، لیکن لکھنویت سے دور رہے، آرزو کو جملہ اصناف سخن پر قدرت کاملہ حاصل ہے، مگر زیادہ رجحان غزلوں کی طرف ہے، مہارت فن، قدرت زبان و بیان اور تاثیر جذبات کے لحاظ سے لکھنؤ میں آرزو کا مدمقابل کوئی نہیں۔ غزل گوئی میں کسی کے مقلد نہیں رہے اور سب سے جدا روش اختیار کی۔ زبان سلیس بامحاورہ اور آسان ہے، محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال برجستگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اکثر جگہ شوخی و معاملہ بندی اور نوک جھونک بھی موجود ہے۔ خیالات کی سادگی و شیرینی جذبات کا درد و اثر، اور زبان کی نرمی و شستگی میں

منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ خالص اُردو میں غزلیں کہنے کا شرف صرف انھیں کو حاصل ہے، اکثر غزلوں میں عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں تغزل کم ہوگیا ہے۔

کلام آرزو کے تین مجموعے فغانِ آرزو، جانِ آرزو، سُریلی بانسری شائع ہو چکے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

بڑی دشمنی کر گئے دوست بن کر　　اب ان سے سوا دل ستا تا رہے گا

اے مرے زخم دلنواز غم کو خوشی بنائے جا
آنکھوں سے خوں بہائے جا ہونٹوں سے مسکرائے جا

رہنے دو تسلّی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

جینا ہی تو دکھ بھی ہیں سکھ بھی، رونا بھی ہے ہنسنا بھی
بین ایک ہی ہوتی ہی جس پر سب راگ بجائے جاتے ہیں

اب آرزو اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لا کے رکھو تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

الفت بھی عجب شے ہے جو درد وہی درماں
پانی پہ نہیں گرتا جلتا ہوا پروانہ

سب تو خیر اُن کی حال پُرسی پہ　　دل اُمنڈ آیا اشک بھر آئے

چٹکی جو کلی کوئل کو کی الفت کی کہانی ختم ہوئی
کیا کس نے کہا؟ کس کس نے سُنی یہ بات زمانہ کیا جانے؟

حسرت موہانی

۱۸۷۵ء — ۱۹۵۱ء

سید فضل الحسن نام، حسرت تخلص ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اوناؤ میں پیدا ہوئے، عربی و فارسی گھر پر پڑھی اور انگریزی کی تعلیم اسکول اور کالج میں پائی۔ علی گڑھ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی، زمانہ طالب علمی نہایت شاندار رہا ہمیشہ اول پاس ہوکر گورنمنٹ سے وظیفہ حاصل کرتے رہے، بی۔اے پاس ہونے کے بعد اُردوے معلّٰے کے نام سے ایک معیاری ماہنامہ بھی جاری کیا تھا جو عرصہ دراز تک علم و ادب کی خدمت کرتا رہا، حسرت اگرچہ مذہبی آدمی تھے لیکن تنگ نظر نہیں، تین بار حج کی سعادت حاصل کی، بڑے وسیع المشرب و مرنجان مرنج بزرگ تھے، تصوف کا رنگ ابتدا سے غالب تھا۔ ۱۳؍ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔

حسرت طالب علمی کے زمانہ سے شعر و سخن کے شیدائی تھے، جلال لکھنوی کی شاگردی حاصل کی اور انھیں سے علم عروض سیکھا، حسرت جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے ان کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ سیاسی رجحانات، آزادی اور آزادہ روی، بے خوفی اور اصول پسندی کی جھلک ان کے کلام میں نمایاں ہے، ان کی طرفہ طبیعت نے چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی، ان کے کلام میں زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود تھی، ان کی طبع نے میرؔ غالبؔ، مصحفیؔ، مومنؔ، نسیمؔ، تسلیمؔ، قائمؔ، غرض ہر استاد سے فیض اُٹھایا تھا۔ ان کے کلام میں مومنؔ کی جدت ادا و ندرت بیان، مصحفیؔ کی سلاست و روانی، میرؔ کا سوز و گداز، جراتؔ کی شوخی و رنگینی پائی جاتی ہے اور اسی لئے ان کے شعر سنتے ہی دل میں اُتر جانے والے ہوتے ہیں، انھوں نے غزل کو نیا رنگ تغزل

شامل کر کے اس کے بے روح جسم میں جان ڈال دی۔ دراصل جدید غزل کے احیار کا سہرا حسرت کے سر ہے۔ درد و اثر، شیرینی و دلکشی، لطافت بیان، جدت اسلوب، صحیح اور سچے جذبات، جوش و شوق، شوخی و شگفتگی، عشقیہ جذبات اور احساسات کی تصویر کشی، واردات قلب کی نقاشی، تصوف کی چاشنی، سیاست و مذہب کی ترجمانی، آزادی و حریت کی تڑپ، حسرت کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

حسرت کا کلام، کلیات حسرت، کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں تیرہ دیوان اور ایک ضمیمہ ہے۔ حسرت نے جملہ اساتذہ کے کلام کا انتخاب کر کے اردو شعر و ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں ... آپ کی یاد کے سوا نہ رہا
رہ و رسم وفا وہ بھول گئے ... اب ہمیں بھی کوئی گلہ نہ رہا
لطف ہے ہم پہ پھر بھی غیر سے کم ... آپ کہتے رہیں ہزار بہت
کار و بار شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوق شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
اپنا سا شوق اور دل میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہمرہاں سے ہم
تھی کبھی یاد ان کی وجہ سکوں ... اب کسی حال میں قرار نہیں
جور پر جور جفاؤں پہ جفائیں دیکھیں ... حوصلہ اپنی محبت میں ہمارا دیکھو
مصیبت بھی راحت فزا ہو گئی ہے ... تری آرزو رہنما ہو گئی ہے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد ... جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

سیماب اکبر آبادی

۱۸۸۰ء۔ ۱۹۵۱ء

عاشق حسین نام سیاب تخلص، والد کا نام مولوی محمد حسین ہے، سیماب آگرہ میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے، اجمیر میں عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی میں ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ ذوق مطالعہ فطری تھا۔ جس نے سیماب کو شعر وادب کا مہر درخشاں بنا دیا۔ آگرہ میں قصر الادب قائم کر کے اُردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں، تقسیم وطن کے بعد کراچی چلے گئے اور وہیں ۱۹۵۱ء میں ۷۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔

شاعری کا ملکہ خداداد تھا، ۱۸۹۸ء میں داغ کے شاگرد ہوئے لیکن جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کے زمانہ میں حالی، شبلی، اقبال کے رنگ میں قومی اور سیاسی نظمیں لکھنے لگے۔ شاعری میں بلند خیالات، اعلیٰ انسانی جذبات، فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات بیان کئے ہیں۔ کلام میں پختگی، روانی، اصلیت، جوش اور رمز ہے، زبان کی صحت اور صفائی، روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی ہے یوں تو جملہ اصناف سخن پر قدرت کاملہ رکھتے تھے، لیکن نظم جدید کی طرف خاص توجہ دی۔

تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے تھا۔ سیکڑوں کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں، درحقیقت سیماب کی ذات اس عہد میں شعر و ادب کے لئے مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

بڑھا دی داستاں جب میرا قصہ مختصر دیکھا ۔۔۔ وہ آئے نزع میں تجدید کرنے رسم الفت کی

اب کیوں ہمارے سامنے آتے ہوئے حجاب
جب خوگرِ تجلی مستور کر دیا
ہو کتنی ہی خوشگوار پھر بھی
ہے دل کے لئے بلا تمنا
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر
ہر چیز پہ بہار تھی ہر شے میں حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں
کبھی پھول بن کر کبھی اشک بن کر
ہو رنگینیِ دامن و آستیں پر
وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں
دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو
کچھ وقت کٹ گیا جو تری یاد کے بغیر
ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے

بیخود دہلوی

۱۸۶۲ء ـ ۱۹۵۵ء

حاجی سید حمید الدین احمد بیخود ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء بمقام ریاست بھرت پور پیدا ہوئے، والد کا نام سید احمد سالم تھا، دہلی میں قدیم رسم کے موجب عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا حالی سے بھی استفادہ کیا اور انھیں کے ایما سے داغ کے شاگرد ہو گئے اور چند سال کی محنت سے باکمال ہو گئے۔

انگریزوں کو اُردو فارسی کی تعلیم بتیس سال تک دیتے رہے، سیر و شکار کا بھی بے حد شوق تھا، بڑے خلیق، ملنسار، زندہ دل اور پابند وضع تھے، عمر بھر زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔

۱۹۵۵ء میں دہلی میں انتقال کیا۔ گفتار بیخود یادگار ہے۔

بیخود اہل زبان تھے، داغ کو ان کی زباندانی پر فخر تھا، کلام میں روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی، فصاحت و سلاست کی فراوانی ہے، خیالات پاکیزہ اور بلند ہیں۔

یہ دل کبھی نہ محبت میں کامیاب ہوا — مجھے خراب کیا آپ بھی خراب ہوا

دردِ سے آشنا نہ ہو جب تک — آدمی کام کا نہیں ہوتا

خدا وقت ایسا نہ ڈالے کسی پر — اجل بھی تو رو دی مری بے کسی پر

اس گلشن ہستی میں لگتا نہیں دل اپنا — آئے ہیں خدا جانے ہم کس سے جدا ہو کر

کچھ حوصلے ہی پست بہت آدمی کے ہیں — ورنہ ہر اک نگاہ میں جلوے اسی کے ہیں

الٰہی گل پہ کیا گزری چمن میں — کہ بگڑی ہی شکل پھر اُس نے کلی کی

مرے افسانۂ دل سے زمانہ ہو گیا واقف — بہت اب اسفِ سحر سے کھٹکا ہوا پڑا نہ رہتا ہی

کیفی دہلوی

۱۸۶۶ء - ۱۹۵۵ء

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت کنھیا لال کے بیٹے تھے، ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔

پنڈت نرائن داس ضمیر سے شاعری کا مذاق پایا۔ ابتداء غزل گوئی سے کی، مگر بہت جلد اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ انگریزی، فارسی، ہندی، عربی اور سنسکرت کے عالم تھے اُردو مادری زبان تھی، تمام عمر اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ انجمن ترقی اُردو ہند سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ ادب بیان کی گہری نگاہ تھی، نثر و نظم دونوں میں متعدد تصانیف ہیں۔ خمخانہ کیفی، واردات، پریم ترنگنی، بھارت درپن، شوکت ہند وغیرہ نظم میں، اور کیفیہ چراغ ہدایت، پریم دیوی، راج دلاری ڈراما وغیرہ نثر میں یادگار رہیں۔

نومبر ۱۹۵۵ء میں کیفی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال سے اُردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔

کیا ہوا مرکز ہستی اگر انساں نہ ہوا — آبرو خاک سے ہے قطرہ کی جو طوفاں نہ ہوا

بے خودی نے محو حیرت کر دیا — آپ میں اپنا تماشا ہو گیا

گل کیا؟ ہے پتّے پتّے میں اک شان لبری — آنکھیں تمھاری طالب دیدار رہی نہیں

آدمی بت اور بت تصویر ہو — گفتگوئے بے زبانی اور ہے

سمجھ کے زیست کو دو روزہ کیوں ہوا مایوس — جہاں ہے تیرے لئے اور تو جہاں کے لئے

مولانا ظفر علی خاں

۱۸۷۰ء - ۱۹۵۶ء

ظفر علی نام، ظفر تخلص، ۱۸۷۰ء میں کرم آباد ضلع گجرانوالہ میں پیدا ہوئے والد مولوی سراج الدین احمد خاں محکمہ ڈاک میں انسپکٹر تھے۔ ظفر نے مڈل تک تعلیم وزیر آباد میں حاصل کی میٹرک کا امتحان پٹیالہ سے پاس کیا، علی گڑھ سے ایف اے کیا اور کشمیر میں محکمہ ڈاک میں ملازمت کر لی لیکن علی گڑھ واپس آ گئے ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری لی کچھ دن بمبئی میں محسن الملک کے پرائیویٹ سکریٹری رہے، پھر حیدر آباد دکن کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں مترجم کے عہدے پر مامور ہوئے ترقی کرتے کرتے رجسٹرار بن گئے اور ۱۹۰۵ء میں بعض سازشوں کی بدولت پنشن لے لی۔ اسی زمانہ میں انھوں نے لارڈ کرزن کی کتاب پرشیا کا ترجمہ خیابان فارس کے نام سے شائع کیا۔ پھر امریکی سائنسداں کی کتاب کا ترجمہ 'مذہب و سائنس' کے نام سے کیا۔ دونوں کتابوں پر ایک ہزار روپیہ اور پانچ سو روپیہ کا انعام حکومت حیدر آباد نے دیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے بھی پانچ سو کا انعام مذہب سائنس پر دیا۔ روس جاپان کی جنگ پر ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ مولانا نے ۱۹۰۳ء میں حیدر آباد 'افسانہ' نامی ماہنامہ بھی جاری کیا تھا،

وہیں سے دکن ریویو بھی نکالا تھا۔ حیدر آباد سے واپس آنے کے بعد ۱۹۰۹ء میں ہفت روزہ زمیندار کی ادارت سنبھالی۔ اور ۱۹۱۱ء میں اسے روزنامہ کر دیا۔ اسی اخبار کے ذریعہ برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔ مولانا نے ۱۹۱۳ء میں برطانیہ اور ترکی کا بھی سفر کیا۔ ۱۹۱۷ء میں زمیندار بند کر دیا گیا، اور مولانا کو کرم آباد میں چار سال قید رکھا گیا، اسی زمانہ میں کرم آباد سے ہفت روزہ ستارۂ صبح جاری کیا جسے ۱۹۱۸ء میں لاہور سے روزنامہ کر کے نکالنے لگے، اس کے بعد مولانا حیدر آباد چلے گئے اور دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے، غرض مولانا کی ساری زندگی اسی کشمکش میں گزری۔ لیکن زبان و ادب کی ہمیشہ خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

مولانا کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ بلا کے طباع، قادر الکلام اور زود گو تھے، زبان اور محاورے کے بادشاہ تھے۔ زبان پر قدرت کاملہ حاصل تھی مشکل ترین سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا معمولی بات تھی۔ ابتدا میں مولانا نے انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ مولانا کو مناظر قدرت اور جذبات فطرت کی عکاسی میں کمال حاصل تھا، کلام میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے، نعت گوئی میں خاص ملکہ تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا

وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

وہ جنس نہیں ایماں جسے لے آئیں دوکان فلسفہ سے
ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سیپاروں میں

مغربی تہذیب کے پتلے

سنو اچھی طرح اے مغربی تہذیب کے پتلو — کہ ہم اتنا ہی ابھریں گے دباؤ گے ہمیں جتنا
سنبھل کر ڈالیے گا ہاتھ صاحب صنف نازک پر — کہیں محشر نہ بن جائے یہ عورت ذات کا فتنا

رضا علی وحشت

۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء - ۲۰ر جون ۱۹۵۶ء

رضا علی نام وحشت تخلص ۱۸۸۱ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ ذوق شاعری بچپن سے تھا، جرأت کی آخری یادگار تھے، ذہانت، طباعی خداداد تھی، شعروشاعری میں وہ کمال حاصل کیا کہ موجودہ دور میں اردو کے اساتذہ میں شمار کیے جانے لگے، زبان و بیان کی خوبی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ۲۰ر جون ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔

بنگال کی خوش قسمتی تھی کہ اس صوبے میں اردو کا ایک ایسا شاعر پیدا ہوا جو غزل گوئی میں استادانہ حیثیت کا مالک ہے۔ وحشت غالب سے کسی حد تک متاثر ہیں، ان کے کلام میں حکیمانہ انداز بھی پایا جاتا ہے اور عارفانہ انداز بھی۔ مگر تغزل کا رنگ کسی حالت میں بھی کم نہیں ہو پاتا۔

چلتا رہا ہمیشہ میں اک طرز خاص پر — یعنی فریب خوردۂ دیر و حرم نہ تھا
ہے ترے وصل کو درکار فنا کی تعلیم — قطرہ دریا سے گریزاں ہے گہر کیا ہوگا
بے جرم جان کیوں نہ دیا قتل گہ میں بار — ظالم ہے اور بے سبب آزار بھی نہیں

پسند خلق ہوئی ہے ستمگری اس کی
یونہی عزیز جہاں ہے وہ مہرباں کیوں ہو

اتنا بھی نہیں یاد کہ کس کی ہے مجھے یاد
ملے بے خودیٔ شوق یہ کیا رنگ ترا ہے

ہزاروں حسرتوں کا نقش ہی آئینۂ دل پر
مرا سینہ ہے یا اک حیرت آبادِ تمنا ہے

یگانہ چنگیزی

۱۸۸۲ء - فروری ۱۹۵۶ء

نام مرزا واجد حسین تخلص پہلے یاسؔ پھر یگانہؔ اختیار کیا۔ مرزا صاحب کی ولادت ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء میں بمقام عظیم آباد ہوئی، ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔ عربی و فارسی میں معقول استعداد رکھتے تھے اور انگریزی میں بھی کافی دخل تھا۔ ۱۹۰۴ء میں یگانہ مٹیا برج گئے وہاں سخت بیمار پڑے، ۱۹۰۵ء میں علاج کے لئے لکھنؤ آئے، اور اسی کو اپنا وطن بنالیا اور یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی کرلی، ایک وقت میں لکھنؤ کے شعراء سے شعر و شاعری کے سلسلے میں بے لطفی ہوگئی، اس جنگ میں مرزا غالب کی بھی مٹی پلید کی گئی۔ یگانہ مرزا غالب سے ایسا خفا ہوئے کہ غالب شکن بن گئے آخر عمر تک غالب کے خلاف دل سے غبار نہ نکلا۔ ۱۹۵۶ء میں لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔

یگانہ شروع سے ہی بڑے ذہین و طباع اور خوش فکر و خوش ذوق شاعر تھے، لکھنؤ کی مصنوعی و بے کیف شاعری کا رخ حقیقی تغزل کی جانب پھیر دینے کا سہرا انھیں کے سر ہے، یگانہ کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ اثر کرتی ہے وہ زورِ کلام ہے، بندش کی چستی کے علاوہ بلند مضامین کے لئے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو مفہوم اور خیال کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ یگانہ کے کلام میں تخیل کی

بلندی، حقائق کی ترجمانی اور ذہن کی پرواز نمایاں ہے، فارسی ترکیبوں اور تشبیہوں کی جدت سے طرز بیان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان صاف شیریں، سادہ اور شگفتہ ہے۔ مصرعے نہایت چست ہوتے ہیں۔ الفاظ و تراکیب کی پیچیدگی میں مفہوم اُلجھنے نہیں پاتا اور معنی اور مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ یگانہ کا رویہ نہ صرف روایتی طرز بیان بلکہ پامال و افسردہ موضوعات شعر کے بھی خلاف ہمیشہ باغیانہ رہا، انھوں نے اسرار و رموز حیات کو عنوانات شاعری بنا کر غزل کو وسعت دی، ابتدائی کلام درد و اثر سے مالا مال تھا لیکن بعد میں جذباتی تلخی کی وجہ سے اس میں نمایاں کمی ہوگئی۔

نمونہ کلام یہ ہے :-

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے | وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا
سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد | سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

اللہ قفس میں آتے ہی کیا مت پلٹ گئی
آخر ہمیں تو ہیں کہ پھڑکتے تھے جال میں

لپٹتی ہے بہت یاد وطن جب دامن دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے
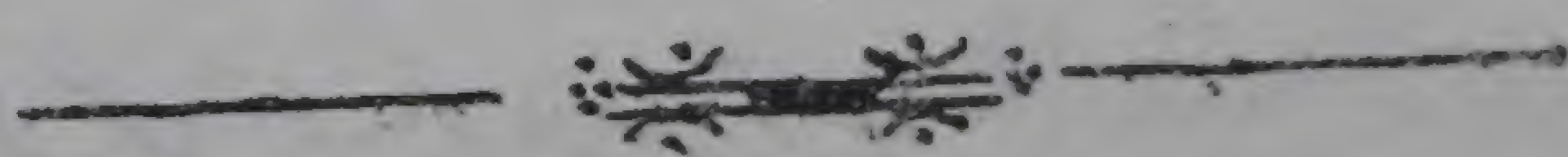
جگر مُرادآبادی

سنہ ۱۸۹۰ء — ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

نام علی سکندر، تخلص جگر، والد کا نام علی نظر، بمقام مرادآباد سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو ونما پائی، فارسی کی استعداد اچھی اور انگریزی کی معمولی تھی۔ شاعری جگر کو ورثہ میں ملی تھی، شگفتہ مزاجی، رنگینی اور موزونی طبع خداداد تھی، بارہ تیرہ سال کی عمر سے شاعری کے کوچہ میں قدم رکھا، پہلے اپنے والد سے اصلاح لی، اس کے بعد داغ کو اپنا کلام دکھانے لگے، پھر تسلیم کی شاگردی اختیار کی، لیکن فائدہ زیادہ تر اصغر گونڈوی سے اٹھایا، جگر قدیم رنگ کے شاعر ہیں، کلام میں حقائق و معارف کی چاشنی اصغر کی صحبت کا فیض ہے، ان کی غزلیں سادگی، برجستگی، شوخی، معاملہ بندی، دلکشی، رنگینی، کیف و سرمستی، بیخودی ترنم اور حسن کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ شعر کہنے اور شعر پڑھنے میں جگر نوجوان طبقہ پر چھائے ہوئے رہتے تھے۔ جا بجا تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی، ان کے کلام سے ایک قسم کے جوش و سرمستی کا اظہار ہوتا ہے، جگر نے عمیق مضامین کی تلاش میں قابل قدر کوشش کی ہے، متانت، زور اور پختگی سے بھی ان کا کلام خالی نہیں ہے۔ ثقیل الفاظ کبھی نہیں استعمال کرتے ہیں، مناسب اور دلنشیں فارسی ترکیبوں سے ان کے کلام کا حسن اور زیادہ ہو جاتا ہے، محاورات اور روزمرہ کے برمحل استعمال سے کلام میں برجستگی پیدا ہو جاتی ہے۔

پچاس پچپن برس تک مسلسل جگر کے نغمے والہانہ انداز اور دلکش ترنم میں

لوگوں کو مسحور و مسرور کرتے رہے۔

۹ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو جگر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، اور ان کی "عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ گیا"، پورے ملک نے جگر کا سوگ منایا، رسائل و اخبارات نے جگر نمبر شائع کئے، وفات کی سیکڑوں تاریخیں کہی گئیں، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

داد غلی جنتی حب گر الحاج	شاعر خوش بیاں و مرد معین
۱۳۸۰ھ	۱۹۶۰ء

جگر کے کلام کے تین مجموعے داغ جگر، شعلۂ طور اور آتش گل، شائع ہو چکے ہیں، نثر میں چند تقاریظ اور دیباچے ہیں، آتش گل، پر حکومت نے پانچ ہزار روپیہ انعام دیا تھا، یو۔پی کی حکومت کی طرف سے جگر کو دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

نقش وفا کا رنگ مٹایا نہ جائے گا
مل بھی گیا جو زہر تو کھایا نہ جائے گا

فریاد کیسی کس کی شکایت کہاں کا حشر
دنیا ادھر کو ٹوٹ پڑی وہ جدھر ہوا

شاید اسی کا نام مقام فنا نہ ہو
نازک سا ہوتا جاتا ہے دل ہر صدا کے بعد

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

عجب انقلاب زمانہ ہے، مرا مختصر یہ فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

کیا آ گیا خیال دل بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

وہ بدگمانیاں ہیں نہ وہ سرگرانیاں
اتنی بھی دل کی دل کو الٰہی خبر نہ ہو

باقی چمن میں کچھ تو ہمارا نشاں رہے
صیاد ہم رہیں نہ رہیں آشیاں رہے
بجھا نہ آتشِ نہاں گرمی کے چھینٹوں سے
دل و جگر کو مجسم گداز رہنے دے
شیشۂ دل وہ ہستیِ نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
اس پہ کسی کے تیرِ ستم کی مشق سیاست کیا کہیے
کلی کوئی جہاں پہ کھل رہی ہے
وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

امجد حیدر آبادی

۱۸۸۷ء — ۱۹۶۱ء

میر احمد حسین نام امجد تخلص حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ میں تعلیم و تربیت پائی، پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا پھر حیدر آباد کے دفتر محاسبی میں ملازمت کر لی ۱۹۶۱ء میں انتقال فرمایا۔ امجد بچپن ہی سے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ حبیب کنتوری سے سلسلۂ تلمذ تھا، انھوں نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ گلستانِ سعدی کا ترجمہ نثر کا نثر میں اور نظم کا نظم میں کیا ہے، نذرِ امجد جمالِ امجد، حجِ امجد نثری تصانیف ہیں۔ نظم میں ریاضِ امجد، خرقۂ امجد اور رباعیات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اردو شاعری میں امجد حیدر آبادی منفرد شخصیت کے مالک ہیں، اخلاق و فلسفہ کے مسائل کو شاعرانہ رنگ میں بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں، رباعیات کی طرف خاص توجہ دی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے رباعیات کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند کر دیا ہے، ان کو زبان اور بیان پر قدرت کاملہ ہے۔

یہ سنگِ نشاں ہے منزلِ مدحت کا — پیدا ہوا پیکر کوئی اس صورت کا
انساں جسے کہتے ہیں یہ دنیا والے — قدِ آدم ہے آئینہ قدرت کا

مر مر کے لحد میں میں نے جا پائی ہے — یاں تک مجھے تیری ہی کشش لائی ہے
آ لے مرے منھ چھپانے والے آ جا — خلوت ہے، شبِ تار ہے تنہائی ہے

کام کیا حسبِ مدعا نہ ہوا — اس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا
ہم تو اک بار اس کے ہو جائیں — وہ ہمارا ہوا، ہوا نہ ہوا
بندگی میں یہ کبریائی ہے — خیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا

آثر لکھنوی

۱۸۸۵ء

نواب مرزا جعفر علی خاں نام آثر تخلص ۱۱ر جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ سے بی۔اے پاس کیا۔ ۱۹۱۹ء میں عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مامور ہوئے، آثر کے والد مرزا افضل حسین خاں اپنی قابلیت اور کمال کی بدولت مشہور و معروف رہے اور اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے، آثر نے شعر و شاعری کے ماحول میں تربیت حاصل کی، اس لیے بچپن ہی میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، لیکن شعر کہنے کا موقع جوانی میں حاصل ہوا، اور عزیز لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، مختلف معزز عہدوں پر مامور رہ کر ریاست کشمیر کے مشیرِ تعلیمات کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ ملازمت کے زمانے میں بھی ادبی ذوق اور شعر و شاعری کا

شغل برابر جاری رہا اور اب تو پنشن لینے کے بعد دن رات یہی مشغلہ ہے۔

جناب آثر نے جن آغوشوں میں پرورش پائی ہے وہ زبان کا گہوارہ تھے اور بلحاظ فصاحت زبان ثقات تکسال کے لقب سے پکارے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ آثر نے خواجہ آتش کی طرح الفاظ کے نگینے جڑے ہیں، شاعری کا ذوق فطری ہے آتش کی زبان کا چٹخارہ، میر کی سادگی اور اثر ہے، آثر کو میر سے نا دیدہ عقیدت ہے، وہ میر کو خدائے سخن اور غالب کو پیغمبر سخن تسلیم کرتے ہیں۔ آثر کے اکثر اشعار ایسے ہیں جن کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمولی الفاظ و اشارہ میں ایسی تہ کی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سمجھنے والے تڑپ جاتے ہیں، روزمرہ محاورہ اور صفائی زبان کا ہر جگہ خیال رکھا ہے، ہمیشہ نرم اور شیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں، ہندی الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں جس سے شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے، آثر کو غزل پر جتنی قدرت حاصل ہے اتنی نظم پر بھی ہے، مناسب الفاظ کا تسلسل جوش اور زور ان نظموں کی خصوصیت ہے متعدد انگریزی و فرانسیسی زبانوں کی نظموں کے ترجمے کر چکے ہیں۔

آثر کے کلام کے کئی مجموعے اثرستان اور بہاراں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، تنقید نگاری میں بھی آثر کو کمال حاصل ہے، چھان بین، مطالعہ غالب اور میر انیس کی مرثیہ نگاری وغیرہ سے ان کی وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، حال ہی میں فرہنگ اثر ترتیب دی ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:-

اپنی وفا نہ اُن کی جفاؤں کا ہوش تھا — کیا دن تھے جب کہ دل میں محبت کا جوش تھا

ناکامیوں کی باغ تمنا میں تھی بہار — گل ریزہ داغ دل تھے جگر گل فروش تھا

دلکش نہ ہو کیوں کلام آثر کا — سیکھا ہے اس نے میر سے فن

نسیم صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی | نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے
نہ کھلنے پہ بھی میرے دل کی کلی | گل تر کی صورت مہکتی رہی
اثر کی سی شیوا بیانی کہاں | بہت یوں تو بلبل چہکتی رہی

موسم اور وقت کی باتیں ہیں راتیں ہیں نہ وہ برساتیں ہیں
رونے میں کبھی طوفان تھے اب دو اشک بہانا مشکل ہے

تلوک چند محروم

۱۸۸۷ء

منشی تلوک چند محروم دریائے سندھ کے کنارے عیسٰی خیل تحصیل کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا، عرصہ تک عیسٰی خیل میانوالی وغیرہ میں ہیڈ ماسٹر رہے اس کے بعد راولپنڈی میں کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ریٹائر ہو گئے لیکن گارڈن کالج میں اردو فارسی کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔ تین برس گزرے تھے کہ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔ محروم آغوش وطن سے محروم ہو کر کسی نہ کسی طرح دہلی پہونچے اور تیج اخبار میں ملازم ہو گئے، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لکچرار مقرر ہوئے۔

شاعری کا ملکہ فطری ہے، بچپن سے ہی مشق سخن کرنے لگے، موزونی طبع بلا کی ہے، محروم کا مشاہدہ گہرا اور تجربہ وسیع ہے، زندگی کے مسائل پر ان کی نظر بڑی گہری ہے، قوم و ملک کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اتحاد و یک جہتی کی وہ جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

مخدوم نے گوناگوں مسائل پر طبع آزمائی کر کے اپنی وسعت نظر کا بہت بڑا ثبوت دیا ہے، وہ تمام اصناف سخن پر قادر ہیں، غزل کے علاوہ قومی، سیاسی اصلاحی اور نیچرل نظمیں بھی کہی ہیں، رباعیات میں انھیں کمال حاصل ہے — انگریزی، فارسی کے پاکیزہ خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو زبان کی بے لوث خدمت کی ہے۔ مخدوم کی زبان نہایت صاف بامحاورہ سادہ اور سلیس ہے طرز بیان بہت سنجیدہ ہے، بحروں کے انتخاب میں روانی و شگفتگی پائی جاتی ہے منظر نگاری میں کافی مہارت رکھتے ہیں، تقسیم ملک سے جن لوگوں کو روحانی دکھ پہونچا ان میں مخدوم بھی پیش پیش ہیں۔

مخدوم کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، گنج معانی، رباعیات مخدوم، نیرنگ معانی، کاروان وطن، شعلہ نوا، بہار طفلی وغیرہ۔

مخدوم کی ایک نظم باد بہاری چلی کے چند اشعار اور ایک رباعی بطور نمونہ پیش ہے۔

گلشن آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی عطر اڑاتی ہوئی
باد بہاری چلی

صحن چمن سے چلی چھیڑتی اشجار کو برگ و گل و خار کو
وصل کے ایام کا بلبل بیمار کو مژدہ سناتی ہوئی
باد بہاری چلی

رُباعی

پاداش عمل کی ہی یہ منزل اے دوست قدرت کا ہے انتظام کامل اے دوست
اعمال بد اپنے بھول جاتے ہیں ہم قدرت ان سے نہیں ہی غافل اے دوست

سراج الحسن سراج لکھنوی

جولائی ۱۸۹۴ء

موجودہ دور میں سراج لکھنوی کے دم سے بزم سخن کی شمع روشن ہے، سراج صاحب کٹرہ ابو تراب خاں میں قیام پذیر ہیں اور اپنے نغموں سے شعر و سخن کی محفلوں کو کیف و سرور عطا کرتے ہیں، سراج صاحب نہایت منکسر المزاج، انسانیت کا پیکر، ہمدردی و خلوص کی جیتی جاگتی تصویر، لکھنوی تہذیب اور اخلاق کے مجسمے ہیں، اُردو شعر و ادب پر ان کی نظر نہایت گہری ہے، ان کا تجربہ وسیع اور مشاہدہ تیز ہے، بدلتے ہوئے حالات کا احساس، ان کے ہر شعر میں موجود ہے، صاف اور ستھری زبان، پاکیزہ خیال، پُر خلوص جذبہ، دلکش انداز بیان، ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ پچاس بچپن برس سے وہ عروس سخن کے گیسو سنوار رہے ہیں۔ سراج صاحب کے کلام کا مجموعہ "شعلۂ آواز" شائع ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام :—

غریب دل کو ترے مسکرا کے لوٹ لیا
ستم تو یہ ہے کہ اپنا بنا کے لوٹ لیا

سراج اپنی پرائی شاہراہیں جگمگا اُٹھیں
زمانے کا اُجالا ہی چراغ رہگزر اپنا

آنکھوں میں جیسے آج بھی تلخی دھوئیں کی ہے
ہے کل کی بات آگ لگی تھی بہار میں

سراج اب کیا کہوں محتاج غم ہے کیوں خوشی میری
بغیر آنسو بہائے مسکرانے کو ترستا ہوں

جب اہل ہونا تو جلووں کا مول بھی کرنا
ابھی تو اپنی متاع نظر کی بات کرو

وہ اشک غم نہیں پھوٹیں نہ جن سے آتشیں نغمے
سُنو بہتے ہوئے پانی میں بھی آواز ہوتی ہے

نہ پوچھو آہ یہ تعمیر کے علم بردار
نہ جانے کتنے نشانِ مزار کھو بیٹھے

جوشؔ ملیح آبادی

۱۸۹۴ء

شبیر حسن خاں نام جوشؔ تخلص ۱۸۹۴ء میں قصبہ کنول ہار ملیح آباد میں پیدا ہوئے والد کا نام محمد بشیر احمد خاں تھا، سایہ پدری بچپن ہی سے اٹھ گیا، عربی فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی اور انگریزی کی تعلیم سینیر کیمبرج تک پائی، ادبی خدمات کے لحاظ سے جوشؔ کا خاندان ممتاز ہے، فقیر محمد خاں گویا دادا اور والد دونوں شاعر تھے، جوشؔ میں شعر گوئی کا جذبہ بچپن ہی سے پیدا ہوگیا تھا، خداداد ذہانت اور فطری ذوق نے راہ راست سے قدم ہٹنے نہ دیا، علمی مذاق ہر صورت میں قائم رہا۔ جوشؔ کچھ عرصہ تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ملازم رہے، اس سے الگ ہوکر دہلی سے ایک رسالہ کلیم شائع کرنا شروع کیا۔ کافی عرصہ تک مرکزی حکومت کے رسالہ آجکل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، آج کل پاکستان میں مقیم ہیں۔

جوشؔ نے اپنا ابتدائی کلام عزیز لکھنوی کو دکھایا، جوشؔ کو جملہ اصناف سخن بالخصوص غزل، رباعی اور نظم پر قدرت کاملہ ہے، لیکن شہرت نظموں کے ذریعہ ہوئی جوشؔ کی نظمیں انقلابی، باغیانہ اور اصلاحی ہیں، ان کے نزدیک وہ شاعری بہتر ہے جو انسان کو قوت عمل بخشے، وہ اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے ایسے الفاظ جو شعریت کو مجروح نہ کریں، شامل کرنے پر متفق ہیں، ردیف و قافیہ کی پابندی اسی حد تک روا سمجھتے ہیں جس سے شعر میں نقص اور خرابی پیدا نہ ہو۔

جوشؔ کی نظمیں رنگینی اور ندرت تخیل کے اعلےٰ نمونے ہیں، حسین تراکیب اچھوتی اور خوبصورت تشبیہات بکثرت ہیں، داخلی و خارجی کیفیات کی منظر کشی خوب کرتے ہیں

غزلیں جدید و قدیم دونوں رنگوں میں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں، مگر خود اس کو غیر فطری تصور کرتے ہیں، کلام میں بلا کا جوش و ولولہ پایا جاتا ہے، جوش نے پرانے ایشیائی رنگ تغزل میں بھی انقلاب پیدا کیا، غزل کے مضامین کو وسعت دی، غزل میں جذبات فطرت اور مناظر قدرت کی بھی عکاسی کی اور مسلسل غزلوں کو بھی رواج دیا زبان صاف اور شستہ ہے۔

جوش کے کلام کے پچیس تیس مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان میں روح ادب، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، جنون و حکمت، فکر و نشاط، آیات و نغمات عرش و فرش، سنبل و سلاسل وغیرہ مشہور ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے :-

مُسکرانے کے لئے بے چین ہے صبح وطن
اور چندے ظلمت شام غریباں ہے تو کیا

دل ہوا اتنا خوشی سے ہم کنار
روح کو احساس غم ہونے لگا

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں سے بہار پیدا کر

شگوفوں پر بھی آتی ہیں بلائیں یوں تو کہنے کو
مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کمھلا ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآل گل مگر کیا زور فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

فراق گورکھپوری

۱۸۹۶ء

رگھوپتی سہائے نام فراق تخلص ہے، گورکھ پرشاد عبرت کے فرزند ہیں، ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی ایم اے تک ممتاز اور کامیاب طالب علم رہے، قومی تحریک میں عملی حصہ اس جوش و خروش سے لیا کہ ڈپٹی کلکٹری اور آئی سی ایس سے بھی دستبردار ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں پروفیسر مقرر ہوئے، لیکن اردو شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔

ذوق شاعری لڑکپن سے تھا، ماحول بھی شعر و سخن کا پایا تھا، پہلی غزل ۱۹۱۵ء میں کہی اساتذہ کا کلام بنظر غائر مطالعہ کرتے رہے، امیر مینائی کے متبع ہیں اور علامہ اقبال کو نظم و غزل دونوں میں استاد مانتے ہیں، لیکن ناصری اور وسیم خیرآبادی سے اصلاح سخن لی۔

فراق نئے دور کے اردو شاعروں میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، ان کی شاعری میں مغربی فن و ادب کے اثرات اور ہندی و سنسکرت کلچر کی لطافتیں بڑی خوش آہنگی سے سموئی ہوئی ملتی ہیں، فراق کا تغزل دور حاضرہ کے میلانات کا مظہر ہے وہ حیات و کائنات کے نئے شعور و احساس، انفرادیت اور آفاقیت کی ہم آہنگی کو غزل میں نمایاں جگہ دینا چاہتے ہیں، ان کے خیالات میں بلندی ہے۔ فراق نے اردو غزل کو نیا ذہن دیا ہے اگر اس جدید ذہن کو خوشگوار اور ہم آہنگ رچاؤ بھی مل جاتا تو خاصے کی چیز ہوتی۔ ان کی وفات فروری 1984ء کو ہوئی

فراق کے کلام کے متعدد مجموعے شبنمستان، روح کائنات، رمز و کنایات،

روپ، رنگ، نور، مشعل، گل نغمہ وغیرہ شائع ہو چکے ہیں، نثر میں حاشیے، انداز
اور اُردو کی عشقیہ شاعری مشہور رہیا۔ نمونہ کلام :-

امیدوار اسی کے تھے مہمانِ بہار — اڑی تو بوئے چمن کا دماغ بھی نہ ملا
ہجر میں پہلی نگاہ کا ذکر — کب یاد آئی کب کی بات
چلے آرہے ہیں چلے جا رہے ہیں — کہاں سے کدھر کو خراماں خراماں
یہ غم کے شرارے محبت محبت — یہ جگمگ ستارے حسیناں حسیناں
چھلک کے کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں — نگاہ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں
یہ سوچتا ہوا دنیا سے اُٹھ گیا کوئی — تری نگاہ بھی ہوتی تو کیا ابھی ہوتی

حامد اللہ افسر میرٹھی

سنہ ۱۸۹۸ء

حامد اللہ افسر سنہ ۱۸۹۸ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے، حصول تعلیم کے بعد محکمہ تعلیمات میں معلم ادبیات مقرر ہوئے، تمام عمر درس و تدریس میں گزاری، گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے پنشن لی۔

افسر کو بچپن سے ہی شعر و ادب کا شوق ہے، بچوں کے لئے ان کی نظمیں نہایت دلچسپ ہوتی ہیں، بوڑھے ہونے کے باوجود وہ آج بھی بچوں کے افسر ہیں اور بچوں کی نفسیات کے ماہر ہونے کی وجہ سے اُن کے لئے بڑی دلکش نظمیں لکھتے ہیں۔

آسان اور عام فہم زبان، خیال اور اسلوب کی سادگی، معمولی معمولی چیزوں کو نئے انداز سے پیش کرنے کی صلاحیت افسر کی خصوصیات ہیں، ان کا دل وطن کی محبت سے لبریز ہے، ان کی شاعری وطنی نغموں سے مالامال ہے، ادب جدید کے

رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔

آفسر بیک وقت شاعر، ادیب، نقاد اور افسانہ نگار ہیں، درجنوں ادبی و تنقیدی اور درسی کتابیں لکھ چکے ہیں، کلام کا مجموعہ "جوئے رواں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نورس اور تنقیدی اصول اور نظریے مشہور تنقیدی کتابیں ہیں۔

کمزور کشتی پر زور دھارا | پروردگارا پروردگارا
اب رات کاٹے گا اللہ مالک | دن کچھ نہ پوچھو کیونکر گزارا
کہتی ہے دنیا دل جس کو آفسر | سینے کے اندر ہے اک شرارا

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے | چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے
یہ تپش یہ اضطرابی یہ تڑپ یہ بے کلی | دل ہے آفسر میرا یا اک محشر خاموش ہے
راحت کو زر و مال سے نسبت نہیں کوئی | دولت یہ فقیروں میں ہو شاہوں میں نہیں ہے

اپنے اوپر کر بھروسا جذب دل سے کام لے
یوں نہ ساقی آئے گا اٹھ بڑھ کے مینا تھام لے

حفیظ جالندھری

سنہ ۱۹۰۰ء

حفیظ جالندھر (مشرقی پنجاب) میں سنہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، تھوڑے دن اسکول میں بھی پڑھا، لیکن تلاش معاش نے اسکولی تعلیم سے محروم کر دیا، شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، غزلیں، نظمیں اور گیت لکھنے لگے، اور مولانا غلام قادر گرامی جالندھری سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۲۲ء تک فکر معاش کے لئے جد و جہد کرتے رہے، آخر لاہور میں آ کر مستقل قیام کیا۔

حفیظ کم گو انسان ہیں باتوں میں سادگی اور بے جا تکلف سے دور رہتے ہیں آواز لحن داؤدی ہے جس سے حسن کلام دو آتشہ ہو جاتا ہے، ہلکے پھلکے گیت اور رومانی نظمیں لکھنا، نظم کی نئی نئی شکلیں پیدا کرنا، حفیظ کا خاص آرٹ ہے، حفیظ کے کلام میں شگفتگی، اثر آفرینی اور روانی ہے انداز بیان صاف اور شیریں ہوتا ہے تراکیب اور بندشیں بھی خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان کے کلام میں بعض جگہ زبان و بیان کی پوری صحت نہیں پائی جاتی ہے، الفاظ سادہ اور آسان استعمال کرتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اسی سادگی نے حفیظ کو مقبول بنا دیا حفیظ شاہنامۂ اسلام کی وجہ سے بے انتہا عزت و شہرت اور مقبولیت کے مالک ہو گئے ہیں۔ ان کی حب الوطنی کی نظمیں بھی کافی مقبول ہیں۔

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

رشک عدن ہے باغ وطن بھی
گل بھی ہیں موجود گل پیرہن بھی
نازک بدن بھی غنچہ دہن بھی
لیلیٰ روش بھی شیریں سخن بھی
کچھ کم نہیں وہ اُجڑا چمن بھی

اس کے بھی اک بار کر لے نظارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

آنند نرائن مُلّا

سنہ ۱۹۰۱ء

پنڈت آنند نرائن "مُلّا" ۱۹۰۱ء میں پنڈت جگت نرائن مُلّا کے یہاں پیدا ہوئے۔ مُلّا نے لکھنؤ ہی میں تعلیم پائی، انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو، فارسی کی بھی تعلیم پاتے رہے۔

ایم۔اے اور وکالت پاس کرنے کے بعد انھوں نے لکھنؤ میں وکالت شروع کی اور اپنی قانون دانی کی وجہ سے بہت جلد مشہور و مقبول ہو گئے، ہائی کورٹ کی ججی کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے، مُلّا کے بے لاگ فیصلے بین الاقوامی حیثیت اور شہرت رکھتے ہیں۔ مُلّا کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ ہے، کسی سے تلمذ نہیں ہے، حافظہ خدا داد ہے، شعر ارادۃً نہیں کہتے ہیں، شاعری میں خلوص و صداقت کو پسند کرتے ہیں، اُردو زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ کی شمولیت کو جائز سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ قافیہ اور ردیف کے استعمال سے نظم میں آہنگ پیدا ہو جاتا ہے، نظم میں اقبال و جوش، غزل میں غالب فانی اور جگر کے قائل ہیں۔ مُلّا غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، دونوں میں گہرائی، گیرائی، تازگی، لطافت اور فنی خوبیاں نمایاں ہیں وہ بالعموم اپنے ذاتی تجربات اور اور محسوسات ہی کو نظم کرتے ہیں اور محض خیال پر اپنی شاعری کی بنیاد نہیں قائم کرتے وطنیت اور قومیت کا جذبہ، انسان دوستی اور محبت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جو ان کی شاعری میں بھی نمایاں رہا ہے، ان کی زبان صاف سلیس اور رواں ہے اور انداز بیان منفرد، مُلّا کو اُردو زبان سے عشق ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو دشمنی کی مہم کو وہ ملک کی ترقی اور سالمیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں، اور اُردو کو مشترکہ تہذیب، متحدہ قومیت

اور اتحاد و یک جہتی کا سب سے موثر ذریعہ۔

ملا نے انیس کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے، کلام کے دو مجموعے جوئے شیر، اور کچھ ذرے کچھ تارے، شائع ہو چکے ہیں۔ نمونہ کلام:۔

بس تو یہ بھی نہیں اک پھول قفس میں رکھ لیں اور منگا ہوں میں گلستاں کا گلستاں ہوتا

نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

عرش بریں پہ چمکا آج اور اک ستارہ کس نے خلوص دل سے سر رکھ دیا زمیں پر

دلِ صبر کُن تجھے چاہیے کہ ہو خستگی میں بھی نغمہ زن
کہ وہ آئینہ نہیں موم ہے جو شکستہ ہو تو صدا نہ ہو

اس مے کو نہ پی قطرہ قطرہ گن گن کے نہ لے سانسیں اپنی
جینا ہے تو جی جینے کی طرح جینے کا فقط الزام نہ لے

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

ساغر نظامی

۱۹۰۵ء

محمد یار خاں ساغر ۱۹۰۵ء میں بمقام علی گڑھ پیدا ہوئے، والد کا نام احمد یار خاں ہے، عربی فارسی کی تعلیم مکان پر ہوئی، انگریزی ہائی اسکول تک پڑھی، ذوق شاعری فطری ہے، شاعری میں استادی و شاگردی کے قائل نہیں، ان کا خیال ہے کہ شاعری کی تکمیل مشاہدہ حیات، مطالعہ فطرت اور تجربات سے تعلق رکھتی ہے، شروع میں سیماب اکبر آبادی کو کلام دکھایا ہے، غزلیں، نظمیں، گیت اور رباعیات سب کچھ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، کلام میں ردیف قافیہ کو ترجیح نہیں دیتے البتہ بحر کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں، کلام میں سادگی و شیرینی کے

ساتھ ساتھ درد و اثر ہے، وطنی، قومی اور ملکی نظمیں خوب کہی ہیں۔ فیکنتلا کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ عرصہ تک ایشیا کے ایڈیٹر رہے، اب آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہیں۔ ساغر کا بادۂ مشرق اور شکنتلا اُردو شاعری کا بہترین سرمایہ ہے۔ نمونہ کلام :-

یہ آنسوؤں کی بارش اور جوشِ تصور ہیں — لے ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ڈوب گیا ہوتا

ہوشیار ہو اے فطرت برباد رہوں کب تک — آخر دل آوارہ مائل بہ جنوں کب تک

یاد ہیں خوب یاد ہیں بھولی ہوئی کہانیاں — عشق کی جبہ سائیاں حسن کی لن ترانیاں

نہ ملا کسی سے ترا پتہ نہ حریم حسن کا راستہ — ہمیں راہ عشق میں جا بجا کئی ایک آبلہ پا ملے

گل اسکے غنچے اسکے گلستاں اسکا بہار اس کی — جو قانونِ گلستاں توڑ کر آزاد ہوتا ہے

عرش ملسیانی

۱۹۰۸ء

بالمکند عرش ملسیانی ۲۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو بمقام ملسیان (جالندھر) میں پیدا ہوئے آپ کے والد جوش ملسیانی اُردو و فارسی کے زبردست عالم اور اُردو کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ عرش کی ابتدائی تعلیم ملسیان اور نکودر میں ہوئی، عرش نے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد محکمۂ نہر میں ملازمت کرلی، اوورسیر کے عہدے پر فائز ہوئے، مگر جلد ہی اس غیرادبی ماحول سے بیزار ہو کر استعفیٰ دیدیا، اسکے بعد ایک صنعتی اسکول میں ٹیچر ہو گئے، اسی زمانہ میں پرائیویٹ طور پر بی اے کیا پھر دلی میں مختلف محکموں میں ملازمت کی، آخر کار منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ میں ملازمت مل گئی، ۱۹۴۸ء میں پبلیکیشنز ڈویژن کے شعبہ اُردو میں اسسٹنٹ اڈیٹر چنے گئے اور جنوری ۱۹۵۶ء سے ماہنامہ "آج کل" کے اڈیٹر ہیں۔

عرش ملسیانی کا شمار ملک کے مشہور و معروف شعراء میں ہوتا ہے، اب تک ان کے کلام کے

مختلف مجموعے مثلاً ہفت رنگ، جنگ و آہنگ، آہنگ حجاز، شائع ہو چکے ہیں اور ایک نیم مزاحیہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ پوسٹ مارٹم بھی شائع ہو چکا ہے۔

بگڑی ہوئی قسمت کو بدلتے نہیں دیکھا
آجائے جو سر پر اُسے ٹلتے نہیں دیکھا

اے عرش گنہ بھی ہیں ترے داد کے قابل
تجھ کو کف افسوس ملتے نہیں دیکھا

تیرا کرم نہ ہو تو فغاں میں اثر کہاں
بے التفات خاص غم معتبر کہاں

ہم کو راہ زندگی میں اس قدر رہزن ملے
رہنما پر بھی گمان رہنما ہوتا نہیں

ان کی پیہم نوازشوں کا اثر
میرے حال تباہ سے پوچھو

بے سعی عمل خاک ہے انسان کا جینا
یہ رزم گہ زیست ہے مدفن تو نہیں ہے

یہاں کتنوں کے جی چھوٹے یہاں کتنوں کے دم ٹوٹے
وفا کی راہ کو ہمت شکن کہنا ہی پڑتا ہے

روشن صدیقی

۱۹۱۱ء

شاہد عزیز نام روشن تخلص ہے ۱۹۱۱ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئے اُردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، شاعری میں اپنے والد سے مشورہ سخن کیا۔

روشن کو روحانی شاعری میں ایک خاص مقام حاصل ہے، ان کی شاعری میں مذہبی جذبات و تاثرات کا غلبہ ہے، روشن نظم گو شاعر ہیں ان کی نظمیں شیرینی اور حلاوت کے علاوہ اپنے ترنم کے لئے بھی مشہور ہیں، نظموں کا پیرایہ عموماً ترجیع بند ہوتا ہے یہ طرز روشن کی شاعرانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، بنیادی طریقے سے روشن جدید دور کے شاعر ہیں، نرم و لطیف الفاظ و تشبیہات کی ان کے یہاں بہتات ہے، ان کی نظموں میں تغزل و روانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محراب غزل کے نام سے روشن کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

تغافل کو کرم سمجھا ہے ہم نے
نہیں آساں ہمارا بھول جانا

ذوق یقیں نے کفر کو ایماں بنا دیا
جس در پہ سر جھکا درِ جاناں بنا دیا

محرم راز محبت ہے اگر دل تیرا
تو خدا کے لئے اس راز کو رسوا نہ کر

لڑکھڑاتے ہیں جو آرام گہ منزل میں
کبھی خم تھی انھیں قدموں پہ حوادث کی جبیں

بہت بلند ہے دل کا مقام خودداری
نگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

حرم تک روشنی ہی روشنی تھی
ہم اس عالم میں بت خانے سے نکلے

غم ہستی نے جہاں سے بھی پکارا اے دوست
ہم اسیرانِ غم عشق وہیں تک پہونچے

سکندر علی وجد

سنہ ۱۹۱۴ء

سکندر علی وجد سنہ ۱۹۱۴ء میں بیجاپور، ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں حاصل کی اور وہیں سنہ ۱۹۳۰ء سے شاعری کا ذوق پیدا ہوا اسی سال کالج کے میگزین نورس کے مدیر چنے گئے، سنہ ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور سنہ ۱۹۳۶ء میں مجلس عثمانیہ کے اڈیٹر چُنے گئے، سنہ ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سول سروس کا امتحان پاس کیا، سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک سیتاپور میں عدالتی کام کی ٹریننگ حاصل کی اسی زمانے میں وجد کی شاعری لکھنؤ کے مشاعروں اور ادبی حلقوں میں پہونچی اور سراہی گئی، وجد آج کل ضلع ناندیر (بمبئی) کے اڈیشنل سشن جج ہیں وجد کا پہلا مجموعہ کلام لہو ترنگ سنہ ۱۹۴۴ء میں دوسرا سنہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے انھوں نے ایک طویل نظم کاروان زندگی بھی لکھی ہے، نمونہ کلام یہ ہے :-

اب کے جنوں میں چاک گریباں نہ ہو سکا
کچھ اہتمام جشن بہاراں نہ ہو سکا

یہ خلش ہے کہ مہ نو مسرکامل نہ بنا
دل بنا بھی تو تری یاد کے قابل نہ بنا

موت کتنی ہی شاندار سہی
زندگی کا مگر جواب نہیں

نسیم صبح کی اٹکھیلیوں سے برہم ہے
چمن میں پھول کے چہرے پہ اشتعال کو دیکھ

دل و جاں تری طرز پرسش کے صدقے
مجھے تجھ سے کچھ بدگمانی نہیں ہے

دکھاؤں تجھ کو منظر کیا گلوں کی پائمالی کا
چمن سے پوچھیے نوخیز ارمانوں پہ کیا گزری

آتش ظلم کے شعلوں سے بھڑکتا ہے چمن
دور سے لوگ سمجھتے ہیں بہار آئی ہے

احسان دانش

سنہ ۱۹۱۴ء

احسان الحق نام احسان تخلص، والد کا نام قاضی دانش علی قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں سنہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے، غربت و افلاس نے تعلیم سے محروم کر کے محنت و مزدوری کرنے پر مجبور کر دیا یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا پھر مزدور سے تاجر بنے اور اس کے بعد شاعر مزدور، احسان نے اپنی دنیا آپ پیدا کی ان کی شہرت شاعری کی وجہ سے ضرور ہوئی مگر ان کی شاعری مزدوری کی مرہون منت ہے، ذاتی تجربہ کی وجہ سے احسان مزدور اور مفلسوں کی ایسی عبرتناک تصویر پیش کرتے ہیں کہ بعض اوقات آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں ان کے خیال میں شاعری کا معاشرتی پہلو اہم تر ہے اور زندگی کے جذبات و واقعات کو عام فہم اردو میں ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ سامعہ نواز بحور میں ادا کرتے ہیں۔

احسان انقلابی شاعر ہیں منظر نگاری جذبات انسانی کی تصویر کشی تشبیہ و استعارے کا حسب موقع اچھوتا اور دلکش استعمال، احسان کے کلام کی خصوصیات ہیں، احسان نے

نظم میں اقبال سے فیض اٹھایا ہے اور اکثر نظمیں انھیں کے انداز میں لکھی ہیں، ان کے یہاں سیدھے سادے مگر دلکش اور مانوس الفاظ ملتے ہیں، ترنم احسان کی نمایاں خوبی ہے جدید تشبیہات اور لطیف شاعرانہ اشارات کثرت سے ملتے ہیں۔ نمونۂ کلام

قیامت نام ہے احسان جس کا بزم عالم میں
ہے اک سادہ ورق میری تباہی کے فسانے کا

دیوانہ ہوں لیکن نہیں زنداں کا مخالف
کیوں سنت ارباب سلاسل کو بدل دوں

ابھی وہ مطرب خوش نوا ہی نگ سوز چھیڑا رہے
کہ نوائے نغمۂ سرمدی ابھی زیر پردۂ ساز ہے

مٹاتا جا رہا ہوں نقش پا صحرا نوردی میں
کہاں ڈھونڈھیں گے مجھ کو میری منزل دیکھنے والے

بخش دی حال نے ہونے جلوہ سامانی مجھے
کاش مل جائے زمانے کی پریشانی مجھے

جگن ناتھ آزاد

۱۹۱۸ء

جگن ناتھ نام آزاد تخلص، والد کا نام تلوک چند محروم، دسمبر ۱۹۱۸ء میں بمقام عیسیٰ خیل پیدا ہوئے، راولپنڈی اور لاہور میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں، شاعری ورثہ میں ملی، آزادی وطن کے بعد جن شعراء کا کلام زیادہ مقبول ہوا، ان میں جگناتھ آزاد بھی ہیں، تقسیم ہند نے آزاد کو وطن سے بے وطن کیا، ۴۷ء کی ہیبت ناکیوں نے ان کے دل و دماغ پر جو اثرات چھوڑے وہ ان کی شاعری سے نمایاں ہیں۔

آزاد اپنی مادری زبان اردو کے شیدائی ہیں وہ اس کی خدمت کرنا فرض عین سمجھتے ہیں اور اردو کے ساتھ جو ناروا سلوک کئے جا رہے ہیں آزاد اس کو صحیح جمہوریت اور ملک کی ترقی کے لئے مضر سمجھتے ہیں ان کے کلام میں درد ہے اثر ہے سوز ہے واقعیت و جامعیت ہے، جدید رنگ تغزل ہے آزاد غزل، نظم اور رباعی کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، انداز بیان شگفتہ ہے، ہند پاک کے

ہر دلعزیز شاعر ہیں، کچھ دنوں تک ماہنامہ "آج کل" کے معاون مدیر رہے اب وزارت اطلاعات میں اُردو کے انفارمیشن افسر ہیں، "بیکراں"، "ستاروں سے ذروں تک"، "وطن میں اجنبی اُردو"، "ابوالکلام آزاد"، "آزاد" کی تصانیف ہیں۔ نمونہ کلام :-

ذرا سا بھی یقین دنیائے فانی میں بڑی شے ہے
گماں کتنا ہی بڑھ جائے گماں سے کچھ نہیں ہوتا

برنگ صبح درخشاں ہر ایک شام اے دوست
غمیں نہ ہو کہ ہمیشہ بدل کے رہتی ہے

اے غم دوست تیری عمر دراز
زندگی ہے تمام سوز و گداز

جب جوش جنوں ہو گرم سفر وہ بند و سلاسل کیا جانے؟
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندی ساحل کیا جانے؟
ہر گام پہ کیوں بل کھا کھا کر بے تاب بگولے اُٹھتے ہیں
محمل کو اس کی خبر کیا ہے؟ اس بات کو محمل کیا جانے؟

نشور واحدی

سنہ ۱۹۱۲ء

حفیظ الرحمٰن نام، نشور تخلص، واحدی خاندانی نسبت ہے، جو تخلص کا جزو اعظم ہے، والد کا نام جمیل احمد صدیقی مرحوم ہے سنہ ۱۹۱۲ء میں بلیا کے ایک گاؤں شیخ پور میں پیدا ہوئے عربی فارسی علوم کی تحصیل و تکمیل الہ آباد اور کانپور میں کی، طبابت بھی پڑھی، لیکن درس و تدریس سے لگاؤ رہا، حلیم مسلم کالج کانپور میں استاد ادبیات ہیں شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں، شعر و ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، وہ اپنے خون جگر سے چمنستان ادب کی آبیاری کر رہے ہیں، ہر وقت فکر سخن میں مستغرق رہتے ہیں۔

نشور کا کلام جلال و جمال کا پیکر ہے، اس میں حسن و عشق کے رموز بھی بیان کئے گئے ہیں اور زندگی کے حقائق کی ترجمانی بھی کی گئی ہے، ترشے ترشائے الفاظ، اشعار میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں، انداز بیان میں ندرت اور تشبیہات و استعارات میں جدت ہے، نشور کا مطالعہ و مشاہدہ بہت گہرا ہے، ان کی غزلوں میں واقعیت بھی ہے اور داخلیت بھی، کہیں کہیں ادق الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں، جس کے لئے نہ تو ان کا جسم متحمل ہے اور نہ غزل کی نزاکت۔

ابھی تک صہبائے ہند، بادۂ روم، شور نشور، آتش نم اور فروغ جام شائع ہو چکے ہیں۔

ہر ذرہ خاکی کو کرن ہم نے بنایا	مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا
کچھ سوچ کے اک راہ پُر خار سے گزرا تھا	کانٹے بھی نہ راس آئے دامن بھی نہ کام آیا
حاصل ہے کائنات کا دردِ دل حیات	دنیا میں کیا رہا مری آہِ سحر کے بعد
مرے آنسوؤں کی ادا کون سمجھے	گلوں کا تبسم نہ سمجھا زمانہ
ہزار شمع فروزاں ہو روشنی کے لئے	نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کے لئے

(۳)

ترقی پسند شعراء

مجاز رُدولوی

سنہ ۱۹۱۱ء ـ سنہ ۱۹۵۵ء

اسرار الحق مجاز، سراج الحق کے فرزند رشید سنہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوئے، طالب علمی کے زمانہ سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا، ترقی پسند شاعری کی تحریک میں مجاز پیش پیش تھے۔ بی اے پاس کرنے کے

بعد متعدد جگہوں پر ملازمت کی، مگر افتادِ طبع ملازمت کی قید و بند سے آزاد کرتی رہی۔

ترک ملازمت کے بعد مجاز نے شعر و ادب کے لئے زندگی وقف کر دی،
حلقۂ ادب اور نیا ادب، لکھنؤ کے سرگرم رکن رہے۔

مجاز ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود ترقی پسندی کی قابل فخر روایات پر عمل نہ کر سکے، ان کی شاعری میں نہ تو عریانیت ہے نہ جنسی بے راہروی، نہ ادبی گمراہی، وہ ترقی پسند نظریات سے متاثر ہو کر خود آوارہ ہو گئے لیکن اپنی شاعری کو آوارہ نہیں ہونے دیا، مجاز کے کلام میں بیک وقت رنگینیٔ ادا، لطافت زبان، جوش انقلاب، جذبۂ حریت اور درد و اثر موجود ہے، سلیس و بامحاورہ زبان، تشبیہ و استعارے مناسب اور جدید ہیں، ان کی نظر بلند اور فکر رسا ہے، زندگی کی محرومیاں و ناکامیاں مجاز کو اور زیادہ باحوصلہ بنا دیتی ہیں۔ مجاز کو نظم اور غزل پر یکساں عبور حاصل ہے، مجاز کی شاعری ترقی پسند شعراء کے لئے شمع راہ ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو آہنگ مجاز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، آہنگ اور ساز نو یادگار ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے :۔

کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے ۔۔۔ جو گانا چاہتا ہوں آہ میں گا نہیں سکتا

ہمدم یہی ہے رہگزر یار خوش خرام ۔۔۔ گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ ۔۔۔ تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

مخدوم محی الدین

۱۹۱۰ء

مخدوم محی الدین ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، پانچ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم عربی فارسی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا

۱۹۳۳ء میں رومانوی نظموں سے کوچۂ شاعری میں قدم رکھا، جو اقتصادی اور سیاسی رنگ میں بدل گیا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی حیدر آباد میں بنیاد ڈالی اس وقت سے ادب نما اشتراکی تحریک، کے سرگرم رکن ہیں، متعدد بار کمیونسٹ ممالک کی زیارت کر چکے ہیں۔

نظریات کے اعتبار سے پکے اشتراکی ہیں اور ان کی شاعری انھیں رجحانات کی آئینہ دار ہے، کسان، مزدور، روٹی، بھوک، مفلسی، ان کی شاعری کی کائنات ہیں۔

ٹیگور اور ان کی شاعری، سرخ سویرا، ان کی تخلیقات ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے:-

کہو ہندوستاں کی جے، کہو ہندوستاں کی جے

قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی

قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی

یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں

یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں

جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمین پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی
کہو ہندوستاں کی جے، کہو ہندوستاں کی جے

فیض

سنہ ۱۹۱۱ء

فیض احمد نام فیض تخلص، سلطان محمد خاں بیرسٹر کے فرزند ہیں سنہ ۱۹۱۱ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ فیض نے پہلے پروفیسری کی اس کے بعد امروز اور پاکستان ٹائمز کی ادارت کی، فیض کو بچپن ہی سے ذوق شاعری تھا۔ شاعری کی ابتداغزلوں سے کی، جذبات حسن و عشق کو نئے آہنگ میں پیش کیا، فیض کو ترقی پسند شاعری میں روز بروز فوقیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

فیض کے کلام میں رومانی رنگ بھی ہے اور فلسفیانہ خیالات بھی ان کے یہاں فکر و گفتار کا ایک بلند اور انفرادی انداز ہے، وہ بات کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کا ماہرانہ سلیقہ رکھتے ہیں، مصائب اور تکلیفوں نے ان کی شاعری میں گہرائی و توانائی پیدا کی مزدور اور غریب کی حمایت اور ملوکیت و سرمایہ داری کے خلاف وہ سینہ سپر بن کر آئے اس لئے ان کے احساس میں شدت اور بیان میں نشتریت پیدا ہو گئی۔ فیض کی ایک غیر معمولی خصوصیت اختصار اور جامعیت بھی ہے۔

فیض کے مجموعۂ کلام دست صبا، نقش فریادی، زنداں نامہ کے نام سے

شائع ہو چکے ہیں ۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

نوائے مُرغ کو کہتے ہیں اب زبانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے

زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

وامق جونپوری

سنہ ۱۹۱۲ء

احمد مجتبےٰ وامق جونپور کے ایک موضع کج گاؤں میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے ان کے والد مصطفےٰ احسین صاحب کلکٹر تھے، وامق نے لکھنؤ میں بی اے کرنے کے بعد وکالت پڑھی، ساتھ ہی شاعری کا شوق بھی پیدا ہوا، وکالت کی پریکٹس چھوڑ کر وامق نے ملازمت کرلی، مگر سرکاری پابندی گوارہ نہ کرسکے۔

وامق کو بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا، قطعات، رباعیات، نظمیں اور غزلیں رومانی انداز میں کہی تھیں، لیکن جنگ عظیم کے بعد جب وامق نے ترقی پسند ادب کے تصورات کی حسین انداز میں ترجمانی کرنا شروع کی تو کامیابی نے ان کے قدم چومے، تعمیر کے بجائے تخریبی سرگرمیوں نے ان کے حساس دل کو متاثر کیا اور انھوں نے حالات سے متاثر ہوکر وقت کی آواز کو شاعری کے سانچے میں ڈھالا، ان کے کلام میں دلکشی بھی ہے اور فن کاری بھی وہ جو بات کہتے ہیں محسوس کرکے کہتے ہیں، ان کا کلام پرتاثیر جامع، صاف اور پاکیزہ ہوتا ہے الفاظ اور بحروں کا انتخاب خوب کرتے ہیں

وامق نے آزاد اور پابند دونوں قسموں کی نظمیں کہی ہیں اور غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے، جذبات اور لب و لہجہ میں تازگی ہے، وامق کی طبیعت میں اعلیٰ درجہ کی موسیقیت ہے اور وہ بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنے مقصد کو سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

جرس کے نام سے کلام وامق شائع ہو چکا ہے۔

زندگی کے تین رُخ

مرے شوق کی وسعتیں دیکھ کر	زندگی کس قدر مختصر ہو گئی
اور تو کچھ نہ مایوسیاں کر سکیں	زندگی تیز سے تیز تر ہو گئی
پہونچے جس وقت منزل پہ تب یہ کھلا	زندگی راستوں میں بسر ہو گئی

"علی سردار جعفری"

علی سردار جعفری

۱۹۱۳ء

علی سردار جعفری ۱۹۱۳ء میں بلرام پور ضلع گونڈہ میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی اور ایم اے بھی لکھنؤ یونیورسٹی سے پاس کیا طالب علمی کے زمانہ میں ہمیشہ ممتاز رہے، سردار جعفری علمی سیاست کے مرد میدان ہیں، بہت ذہین اچھے مقرر اور بڑے دل گردہ کے آدمی ہیں، اُردو کے علاوہ انگریزی ادب سے بھی کافی واقفیت رکھتے ہیں انھوں نے اپنے مطالعہ اور دوسرے ادب کی ترقی یافتہ اور فنی خوبیوں سے فائدہ اٹھا کر اُردو ادب کی ترقی کے لیے انتھک کوشش کی، جعفری نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں اشتراکی نظریہ کی وضاحت کی ہے اور اپنے کلام میں ترقی پسندی کو بڑی خوبی اور فنی حوصلہ مندی کے ساتھ نباہا ہے، جعفری کے کلام میں گیرائی اور دلکشی ہے اور ان کی نظموں میں للکار، گرمی اور جوش ہے تشبیہ و استعارات کا

سہارا لئے بغیر ہر بات صاف صاف اور نڈر ہو کر کہہ دینا جعفری کی ایک اہم خصوصیت ہے

جعفری کے اس وقت تک کئی مجموعے پرواز کے علاوہ چھپ چکے ہیں ان میں خون کی لکیر، نئی دنیا کو سلام، ایشیا جاگ اٹھا، امن کا ستارہ، پتھر کی دیوار، مشہور رہیں۔

ایک بات

اس پہ چھوڑے ہو کہ ہر دل کو کچل ڈالا ہے ۔۔۔ اس پہ پھولے ہو کہ ہر گل کو مسل ڈالا ہے
اور ہر گوشۂ گلزار میں سناٹا ہے

کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہوگی ۔۔۔ آج وہ کچھ نہ سہی کل کو جواں تو ہوگی
وہ جواں ہو کے اگر شعلہ جوالہ بنی ۔۔۔ وہ جواں ہو کے اگر آتش صد سالہ بنی
خود ہی سوچو کہ ستمگاروں پہ کیا گزرے گی

احمد ندیم قاسمی

۱۹۱۶ء

احمد ندیم قاسمی ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو ضلع شاہ پور (پنجاب) کے گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت گاؤں میں ہی ہوئی، چچا کے فیض صحبت سے انھیں بھی ادبی لگن پیدا ہوئی اور بارہ سال کی عمر میں چھوٹا سا ناول لکھ ڈالا اور کچھ اشعار بھی کہہ ڈالے، بی اے پاس کر لینے کے بعد ۱۹۳۷ء میں لاہور میں پھول اور تہذیب نسواں کے اداریے سے وابستہ ہوئے، ۱۹۴۳ء میں ماہ نامہ ادب لطیف کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۷ء میں پشاور ریڈیو میں ملازمت کی ڈیڑھ سال بعد ملازمت چھوڑ کر ماہنامہ نقوش جاری کیا۔ ۱۹۵۳ء میں روزنامہ

امروز کے اڈیٹر ہوئے ۔

احمد ندیم قاسمی اپنے کلام کی بدولت اردو ادب میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی، نثر میں بھی لکھتے ہیں، وہ فطری شاعر ہیں قدرت نے انھیں ایک دردمند دل اور غور و فکر کرنے والے دماغ سے نوازا ہے وہ غریبوں مزدوروں کے حامی اور ملوکیت اور سرمایہ داری سے بیزار ہیں، ندیم کے طرز بیان میں بھی ایک خاص ندرت ہے، لب و لہجہ کے انداز میں ایسا تیکھا پن ہے جو سارے کلام میں تازگی پیدا کرتا ہے، زبان ٹکسالی اور با محاورہ ہے، فارسی و عربی تراکیب اکثر استعمال کرتے ہیں لیکن ان کے کلام میں روانی ہر جگہ نمایاں ہے، ان کا انداز تخاطب نہایت دلکش اور پر تاثیر ہے، انھوں نے نہایت دل آویز اور نیچرل نظمیں لکھی ہیں، ندیم تشبیہ و استعارے نہایت حسین نظم کرتے ہیں، ان کی غزلوں میں عشقیہ مضامین کم ہیں اور فطری عنصر زیادہ ہے ۔

قاسمی کے تین مجموعے جلال و جمال، شعلۂ گل، رم جھم شائع ہو چکے ہیں ۔

مری ٹوٹی ہوئی کلیو مرے اترے ہوئے پھولو

تمھاری ہی مہک سے ذہن انساں تازہ دم ہو گا

کھلے گا پھول بن کر لہلہائے گا چمن بن کر

تمھاری یاد میں اشکوں سے جو رخسار نم ہو گا

جو ابتدائے سفر میں دیے بجھا بیٹھیں ۔۔۔ وہ بد نصیب کسی کا سراغ کیا پائیں

اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا ۔۔۔ تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ

مدت کے بعد اذن تبسم ملا ہمیں ۔۔۔ وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

معین احسن جذبی

سنہ ۱۹۱۲ء
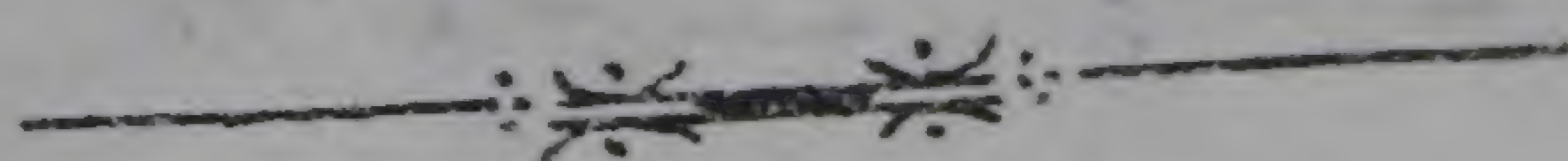
معین احسن جذبی ۱۹۱۲ء میں بمقام اعظم گڑھ پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد ایم اے کیا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اُردو میں لیکچرار ہوئے، اس کے بعد شاعر اور استاد ہونے کے بعد محقق بھی ہو گئے، حالی کے سیاسی شعور پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر بن گئے۔

جدید ترقی پسند شعراء میں جذبی اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں ان کی طبیعت میں سوز و گداز اور فکر میں محو ہو جانے والی کیفیت ہے، سماج کی بُرائیاں سرمایہ داروں کے مظالم، اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافیاں جذبی کو باغی بننے پر مجبور کرتی ہیں، ان کے جذبات میں بغاوت کی آگ بھڑکتی کم ہے سلگتی زیادہ ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی بُرائیاں ان کے یہاں خون جگر میں ڈوبی ہوئی فریاد بن کر اُبھرتی ہیں، جذبی شعر و سخن کا بہت پاکیزہ اور ستھرا ہوا مذاق رکھتے ہیں، ان کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں رہتی ہے اگرچہ کم کہا ہے لیکن جتنا کہا ہے گہری فکر میں ڈوب کر کہا ہے۔

کلام کا مجموعہ فروزاں، کے نام سے شائع ہو چکا ہے، حالی کا سیاسی شعور تحقیقی مقالہ ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں اجالے کے سماں ملتے ہیں

اے موجِ حوادث ایک ذرا ہلکا سا تھپیڑا ان کو بھی
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھ کو یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے

تو اور غم الفت جذبی مجھ کو تو یقیں آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے
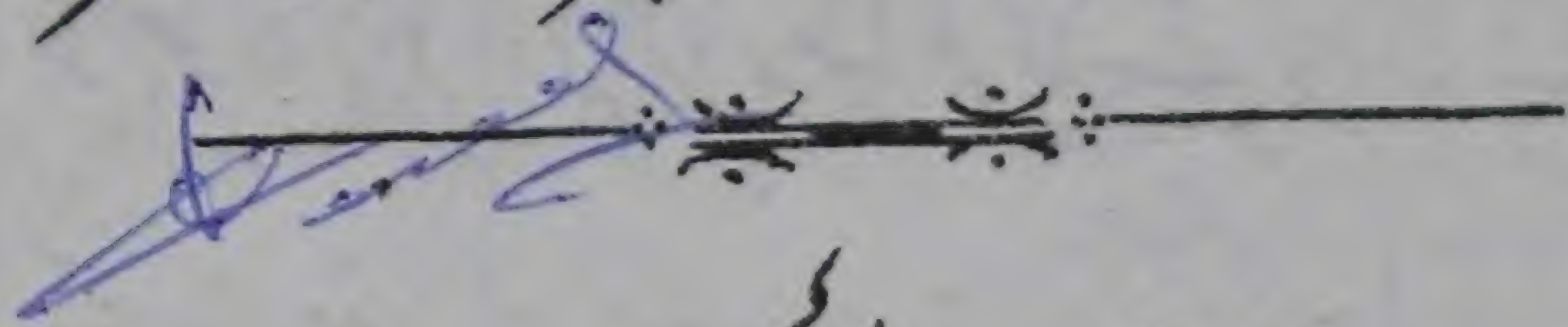
جائزہ

حالی اور آزاد نے اُردو شاعری میں جو صور پھونکا تھا اس نے زندگی و توانائی عطا کی، جدید نظریات اور عصری رجحانات شاعری کی رگ و پے میں سما گئے، مغربی تعلیم کے اثر اور سائنس اور فلسفہ کے مطالعے سے فکر و نظر میں بلندی اور خیالات میں گہرائی آئی، اصلیت اور واقعہ نگاری کا بول بالا ہوا، شاعری میں ہر قسم کے موضوع ادا کئے جانے لگے مسلسل آزاد اور مُعرّیٰ نظمیں لکھی جانے لگیں، مغربی نظموں کے ترجمے بھی کئے گئے۔

غزل نے نیا انداز بدلا، لیکن ترنم، تاثر، داخلی پہلو، ہمواری، یکرنگی، جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی، لطافت و رنگینی، سادگی و پُرکاری قائم رہی، خارجیت کے باوجود داخلیت کم نہیں ہوئی، مسائل تصوف،

فلسفۂ حیات، حقیقت پرستی اور نفسیات کے گہرے مطالعے نے غزلوں کو نیا رنگ اور نیا آہنگ بخشا۔

ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات نے اردو شاعری کو بیحد متاثر کیا، اشتراکی نظریات بڑی تیزی کے ساتھ جگہ پانے لگے، ترقی پسند تحریک نے قدم جمائے اور ترقی پسند شعرا کی ایک با اثر جماعت قائم ہوئی جنھوں نے اُردو شاعری سے تبلیغ اور پروپگنڈے کا کام لینا چاہا، کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے، لیکن عریاں حقیقت نگاری کو اُردو شاعری برداشت نہ کرسکی، اس لئے ترقی پسند شاعروں کو زیادہ محتاط ہونا پڑا اور اُردو شاعری کے مزاج کے بموجب اپنے کو بدلنا پڑا۔

حصۂ سوم

اردو نثر

امتیاز علی تاج سدرشن شوق قدوائی، فرقت، ظفر علی خاں، سید تفضل حسین طالب بنارسی، منشی جوالا پرشاد برق، حکیم ظہر صاحب، محمد عمر نور الٰہی صاحبان مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی، دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر عابد حسین اشتیاق حسین قریشی وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔

طنز و مزاح

اُردو ادب میں ظرافت کی ابتداء انیسویں صدی میں ہو چکی تھی جب کہ مغربی اثر ابھی کوسوں دور تھا اُردو زبان کا سب سے بڑا ظرافت نگار غالب ہے اسی بنا پر حالی نے انھیں حیوان ظریف کہا ہے۔ غالب کے خطوط میں ظرافت کی پاکیزہ اور ستھری چاشنی ہے ان کی بات بات میں طنز و ظرافت کا چٹخارہ موجود ہے۔ غالب کے بعد نثر میں ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں ظرافت پائی جاتی ہے۔

شاعری میں سودا کی ہجوؤں میں دل کا بخار نکالا گیا ہے۔ انشاء رنگین، جان صاحب محض ہنسنے ہنسانے والوں میں ہیں۔ اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی نے شوخی طنز اور مزاح سے اصلاحی کام لیے ہیں۔

اُردو میں ظرافت کی باقاعدہ ابتداء اور ترقی اودھ پنچ کے ذریعہ سے ہوئی جو تیس پینتیس سال تک اردو ادب کے چمن میں ظرافت کے بے شمار رنگین اور دلکش پھول کھلاتا رہا اس کے لکھنے والوں میں رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق منشی احمد علی شوق، اکبر الہ آبادی وغیرہم بہت مشہور ہیں، اودھ پنچ کے اڈیٹر سجاد حسین بہت زندہ دل

آدمی تھے خود بھی ہنستے تھے دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ وہ معاشرت میں قدامت پرست اور سیاست میں جدت کے حامی تھے ایک طرف مغرب کی اندھی تقلید کے سخت مخالف تھے دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کے خواہاں۔ ان کے ناول حاجی بغلول احمق الذین ان کے خطوط گلیڈ اسٹون اور نظام حیدرآباد کے نام توکل علیہ الرحمۃ کے عنوان سے موسم پر ان کا تبصرہ، ایسی چیزیں ہیں جو اچھے اچھے مزاح نگاروں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی زمانہ میں پٹنہ اور دوسرے مقامات سے بھی مزاحیہ رسائل واخبارات نکلنا شروع ہوئے۔

گورکھپور سے ریاض خیرآبادی نے فتنہ جاری کر کے شوخی چلبلے پن اور خوش طبعی کے جوہر دکھائے۔ وہ حسن و عشق اور محبت کے میدانوں کے شہ سوار تھے وہ دوسروں کو اس لیے چھیڑتے تھے کہ ان کی گالیاں کھائیں اور لطف اٹھائیں۔

ان کے بعد آنے والوں میں سید محفوظ علی بدایونی، ظفر علیخاں، سلطان حیدر جوش کے نام لیے جا سکتے ہیں مغربی علوم نے علم وادب کا رنگ بدل دیا ادب کے ہر شعبہ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا مزاح نگاری میں بھی تبدیلی آئی۔ یہ رنگ علی گڑھ سے شروع ہوا اور کونے کونے میں پھیل گیا لیکن چند اصحاب ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے زبان اور ادب کو مزاح پر مقدم رکھا اور ظرافت کی بے باکیوں کو انشا پردازی سے دبایا۔ اس سلسلہ میں سید محفوظ علی بدایونی ظفر علی خاں، سلطان حیدر جوش۔ فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کے نام سر فہرست ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی، شوکت، ملا رموزی نے عمدہ مزاحیہ افسانے لکھے ہیں عظیم بیگ واقعات سے، شوکت تھانوی زبان کی چاشنی سے، اور ملا رموزی اسم فعل و حرف کی بے ترتیبی سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ فرقت کاکوروی نے طنز و مزاح میں نا روا، بیٹیں کر کے

...... ظرافت کا "مداوا" کردیا ہے۔
کنہیالال کپور کی ظرافت اُردو میں روز بروز اہمیت و مقبولیت اختیار کرتی جارہی ہے۔

تحقیق و تنقید

تنقید کے معنی پرکھنے کے ہوتے ہیں۔ جذبۂ تمیز ہی تنقید کی اصل جڑ ہے تنقید اور فن میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تنقید کی ترقی اس فن کی ترقی پر منحصر ہوتی ہے جس سے اس کا تعلق اور واسطہ ہوتا ہے فن کی ترقی ماحول پر منحصر ہوتی ہے اور ہر فن رفتہ رفتہ ہی ترقی کرکے اعلیٰ معیار پر پہنچتا ہے صحیح تنقید فن کے فطری حسن کو نکھارتی ہے اس میں عظمت و توانائی پیدا کرتی ہے۔

یوں تو اُردو ادب میں تنقید کا وجود ابتدا ہی سے ملتا ہے شعراء اور ادیبوں کے اپنے تذکروں میں ان کے زمانے کے ماحول کے مطابق تنقید پائی جاتی ہے۔ لیکن تنقید کی ترقی کا زمانہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا حالی دونوں نے ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے ان ہی بزرگوں نے ادبی تاریخ اور تنقید کو راہ دکھائی۔ محمد حسین آزاد کی زندۂ جاوید تصنیف 'آبِ حیات' نے اُردو نثر میں تحقیق زبان اور تنقید کی نشاندہی کی۔ آزاد فن زبان دانی کے ماہر تھے ان کے ذوق تحقیق نے ادب میں ایک نئی شمع روشن کی۔ لیکن تنقید نگار میں جو خصوصیات ہونا چاہئے۔ آزاد کے پاس وہ خصوصیات نہیں تھیں۔ یہ کام حالی نے انجام دیا۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری فن تاریخ و تنقید کی لاجواب تصنیف ہے انھوں نے مغربی تنقید سے استفادہ کیا اور اسی کی روشنی میں نہایت صاف گوئی اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے قائم کئے ہوئے نظریات کے تحت اُردو کے ذخیرہ شعر و ادب پر

نگاہ ڈالی۔ مقدمہ نے غور و فکر کی نئی راہ دکھائی اور اردو ادب کی جانچ پڑتال کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا۔ حالی کے قائم کیے ہوئے تنقیدی اصولوں کو شبلی نے زیادہ لطافت اور نکھار کے ساتھ پیش کیا اور ان کی روشنی میں شبلی نے شگفتہ و سنجیدہ انداز میں موازنہ انیس و دبیر لکھ کر فن تنقید پر اپنے خیالات کا اظہار وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ مغربی علم و ادب سے واقفیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ تنقید کی نئی راہیں کھلیں مہدی افادی نے تاثراتی انداز میں اپنے دور کے نامور ارباب کے ادبی و شعری کارناموں پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر بجنوری نے تاثراتی تنقید کی لے کو آگے بڑھایا احسن مارہروی۔ وحید الدین سلیم۔ سید سلیمان ندوی۔ ڈاکٹر عبدالحق۔ نیاز فتحپوری، سید مسعود حسن رضوی ادیب، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، اثر لکھنوی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عابد حسین، مولوی اختر علی تلہری، اختر اورینوی، عبدالقادر سروری، خورشید الاسلام، شاہ معین الدین ندوی وغیرہ سب نے اپنے اپنے رنگ میں اردو تنقید میں اہم اضافے کئے۔

تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے جس میں قدیم نسخوں کی تلاش نایاب و غیر مشہور کتابوں کے صحیح متن کی اشاعت، مشاہیر ادب کے کارناموں و مختلف علاقوں کی ادبی و لسانی تاریخ کے لیے مواد کی فراہمی، مخطوطات، لسانیات اور لغات وغیرہ کا مطالعہ شامل ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اردو ادب کے نایاب کمیاب ذخیرہ کو بڑی تحقیق و کاوش کے ساتھ تلاش کر کے ان پر مقدمات لکھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے دکنی مخطوطات پر بیش بہا کام کیا۔ تحقیقی کام اب یونیورسٹیوں کے علاوہ دوسرے اداروں میں بھی ہو رہا ہے جس سے اردو ادب کا دامن نہایت وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ عبدالسلام ندوی، کاظم علی خاں، عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، سید مسعود حسن رضوی، سید نجیب اشرف ندوی، خواجہ احمد فاروقی، اختر اورینوی، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، مالک رام، صباح الدین عبدالرحمن، مختار الدین آرزو وغیرہ کو تحقیق میں اہم مقام حاصل ہے

سوانح نگاری

جدید دور میں تاریخ اور سوانح نگاری کے فن نے کافی ترقی کی ہے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں اصلاح و ترقی کی جو تحریک اٹھی تھی اس نے ماضی کو ایک نئی نظر سے دیکھا اور اس کو ذوق تحقیق کے ساتھ زندہ کیا۔ حالی نے حیات سعدی لکھ کر پرانے طرز کی سوانح نگاری کو ختم کر دیا۔ اس کے علاوہ یادگار غالب اور حیات جاوید بھی حالی نے لکھیں۔ حیات جاوید اردو کے سوانحی ذخیرہ میں خاص مرتبہ و امتیاز کی مالک ہے حالی کے بعد شبلی نے سوانح نگاری میں اعلیٰ ترین کمال حاصل کیا شبلی اردو کے سب سے بڑے مورخ ہیں ان کا دائرہ علم بہت وسیع تھا وہ تحقیق و تجزیہ کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے انھوں نے جو تاریخی تصانیف لکھی ہیں وہ تحقیق کی بلندی اور انشاپردازی کے کمال کا بہترین نمونہ ہے۔

مولانا شبلی کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی، سعید انصاری اور مولانا غلام رسول مہر ممتاز سوانح نگار ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے بھی اردو ادب کو غیر فانی تخلیقات عطا کی ہیں۔ شرر مرحوم کی تاریخی و سوانحی تصانیف بھی کافی اچھی ہیں۔ سوانحی تصانیف میں سلیمان ندوی کی، حیات شبلی، ابوالکلام آزاد کا تذکرہ، عبدالماجد کی محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق، حکیم الامت اور قاضی عبدالغفار کی "آثار جمال الدین" اور آثار ابوالکلام مشہور ہیں۔

مکتوب نگاری : خطوط نویسی

اردو ادب میں مکتوب نگاری کی اہمیت کا احساس خطوط غالب کی اشاعت کے بعد سے ہوا۔ دیگر اصناف سخن کی طرح اردو میں مکتوب نگاری بھی عربی اور فارسی سے منتقل ہو کر آئی ہے ایشیائی ممالک میں جب سرکاری زبان فارسی قرار دی گئی اور دفتروں میں فارسی کا استعمال لازمی قرار دیا گیا تو سرکاری احکامات و پیغامات فارسی زبان میں ہونے لگے اس لیے مکتوب نگاری نے حکومت کی گود میں پرورش پانی شروع کی۔ حکومتی مراسلات میں حکومت کی آن بان اور شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے القاب و آداب میں مرتبہ کے لحاظ سے بہت اہتمام کیا جاتا تھا چنانچہ شاہی انشاء پردازوں نے خطوط کو دلچسپ بنانے کے لیے فن انشاء پردازی کے جوہر دکھانے شروع کیے یعنی خطوط میں تکلف، بناوٹ، مشکل پسندی، عبارت آرائی اور طوالت کی بہتات ہونے لگی یہی اثر اردو خطوط نویسی نے بھی قبول کیا یہی وجہ ہے کہ انشائے خرد افروز، مکتوبات احمدی، رقعات عنایت علی، انشائے اردو اور انشائے سرور وغیرہ کے خطوط اسی انداز کے ہیں۔ غالب نے جب خط لکھنا شروع کئے تو ان کا طرز ہی بدل ڈالا۔ پرانے القاب و آداب کو چھوڑ دیا قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی سے پرہیز کیا اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ غالب نے خطوط نویسی کے جو انداز ایجاد کیے تھے ان کی پوری پوری پابندی انھوں نے کی جس کی وجہ سے ان کے خطوط اردو ادب کا بیش بہا خزانہ بن گئے غالب کا یہ انداز دوسروں نے اڑانے کی کوشش کی لیکن کسی کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ غالب کے بعد آنے والے مشہور و معروف مکتوب نگار سرسید محمد علی، شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد، اکبر، شرر، ریاض خیر آبادی، اقبال، ابوالکلام آزاد، عبدالرحمن

بجنوری، مہدی افادی، حسن نظامی، نیاز فتحپوری وغیرہ وغیرہ ہیں۔

مقالات وصحافت

مقالہ۔ مقالہ میں کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی جاتی ہے، یہ بڑی تحقیق وتلاش کے بعد لکھا جاتا ہے اس کا انداز متین اور سنجیدہ ہوتا ہے، مقالہ کا مقصد افادی ہوتا ہے۔ اردو میں مقالات حالی، مقالات شبلی بہترین نمونے ہیں۔

تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ مقالہ نگاری، بھی عام ہوتی جارہی ہے، ہر قسم کے موضوع پر اردو میں مضامین لکھے جانے لگے ہیں، رسائل کی وجہ سے، مقالہ نگاری کو روز بروز مقبولیت بھی حاصل ہورہی ہے اور اس کا ذخیرہ بھی روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، سید مسعود حسین رضوی ادیب، شاہ معین الدین ندوی وغیرہ جیسے باکمال حضرات کے نام مقالہ کی اہمیت وافادیت کے لیے کافی ہیں۔

صحافت۔ اردو ادب میں صحافت کی عمر سوا سو برس سے زیادہ ہے ۱۸۳۵ء میں اردو اخبار جاری ہوا اس کے بعد انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اردو اخبارات پورے ملک سے نکلنے لگے۔ کوئی صوبہ اور صوبہ کا کوئی مشہور شہر ایسا نہیں تھا جہاں سے اردو اخبارات نہ نکلتے ہوں۔ بیسوی صدی میں صحافت کو اور زیادہ وسعت ومقبولیت حاصل ہوئی روزنامے، دو روزہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہنامے اخبارات ورسائل کی بھرمار ہوگئی ۱۹۴۷ء کے بعد اردو زبان وادب کو تو

ختم کیا گیا لیکن اُردو اخبارات کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی ، اب بھی اُردو اخبارات کا مستقبل روشن ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والا اخبار "ہمارا سماج" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

قاضی عبدالغفار، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید جالب دہلوی، مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، دیوان سنگھ مفتون، مہاشے کرشن، ہری چند اختر، حیات اللہ انصاری وغیرہ میدان صحافت کے شہسوار ہیں۔

انشائیہ

اُردو ادب میں انشائیہ کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو انگریزی زبان ESSAY کا ہے۔

مضمون کے جس حصہ میں مضمون نگار اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی شخصیت نمایاں ہو جائے، وہ انشائیہ کہلاتا ہے۔ انشائیہ میں داخلی رنگ کا پایا جانا ضروری ہے جبکہ مضمون میں خارجی رنگ غالب رہتا ہے اور اس میں علمی، معلوماتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریات غرض زندگی کے ہر شعبہ کا بیان کیا جاسکتا ہے۔

انشائیہ مختصر ہوتا ہے اس کا اسلوب سلیس، شگفتہ، نرم و نازک، دلچسپ و دلکش ہوتا ہے۔ اختصار، بے ربطی، اظہار شخصیت، فرحت و انبساط انشائیہ کی خاص خصوصیت ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، رشید احمد صدیقی کے بعض مضامین انشائیہ کے عمدہ نمونے ہیں۔

لسانیات

اُردو ادب میں لسانیات کی اہمیت کو پچیس تیس سال سے محسوس کیا گیا ہے۔
'لسانیات' سے زبان کی پیدائش اور نسل و خاندان کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اُردو زبان کی پیدائش کب اور کس طرح اور کہاں ہوئی؟ وہ زبانوں کے کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس کے اندر کس کس نسل کے الفاظ ہیں یہ اور اسی قسم کی جملہ باتیں، لسانیات، ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوتی ہیں۔
ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مسعود حسین خاں، سید احتشام حسین، شوکت سبزواری لسانیات کے ماہر ہیں۔ ابھی یہ ابتدائی شکل میں ہے اور اس میں بہت کچھ کام کرنا ہے۔

ان کے علاوہ اردو میں پیروڈی اور ریپورتاژ کو بھی مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

مشہور نثر نگار

فورٹ ولیم کالج سے پہلے

فورٹ ولیم کالج سے پہلے اُردو نثر ابتدائی منزل میں تھی۔ اس کے لکھنے والے خال خال تھے۔ البتہ ہندوستانی مصنفین سے زیادہ یورپین مصنفین نے اُردو نثر نویسی کی طرف توجہ کی ان میں سے چند مشاہیر یہ ہیں۔

ہندوستانی مصنفین

فضل علی فضلی دہلوی فضل علی فضلی، محمد شاہی عہد میں گذرے ہیں، یہ دکنی الاصل تھے لیکن شمالی ہند میں رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کی اور تصنیف و تالیف شروع کی۔ ان کی مشہور کتاب دہ مجلس یا کربل کتھا ہے جس کو ۱۷۳۱ء میں ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہدا سے ترجمہ کیا گیا۔ ۱۷۴۸ء میں اصلاح و نظر ثانی کی گئی۔

مرزا رفیع سودا دہلوی سودا نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اُردو میں لکھا۔ عبارت مسجع مقفیٰ اور پیچدار ہے۔ نثر میں سودا کی کل کائنات یہی ہے۔

مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ شاہ صاحب حضرت ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسے بزرگ باپ کے بزرگ بیٹے تھے جو اپنے علم و فضل، کمال تقویٰ اور پرہیزگاری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ شاہ صاحب نے ۱۷۷۶ء میں قرآن پاک کا اُردو ترجمہ مکمل کیا یہ ترجمہ عربی عبارت کی ترتیب کے مطابق لفظ بلفظ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے غیر مانوس اور بے محاورہ معلوم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کا انتقال ۱۸۱۶ء میں ہوا۔

مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ

شاہ عبدالقادرؒ شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاہ صاحب نے ۱۷۹۰ء میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے شاہ صاحب نے لفظ لفظ اور حرف حرف کا ترجمہ کرنے کے مقابلے میں ادائے مفہوم اور وضاحت مطلب کو زیادہ مدنظر رکھا۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ کے حاشیے پر تفسیر بھی لکھی جس کا نام "موضح القرآن" ہے یہ ان کی اپنی عبارت ہے۔ شاہ صاحب نے ۱۸۱۵ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

میر عطا حسین خاں تحسین

میر عطا حسین خاں تحسین اٹاوہ کے رہنے والے تھے محمد باقر خاں شوق کے بیٹے تھے۔ جنرل اسمتھ کے ساتھ میر منشی ہو کر کلکتہ گئے۔ اس کے بعد پٹنہ اور پٹنہ سے فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متعلق ہو گئے۔ جنرل اسمتھ کی فرمائش پر نوطرز مرصع، لکھی جو ۱۷۹۸ء میں ختم ہوئی۔ یہ کتاب چار درویش کا رنگین اور دقیق اردو میں ترجمہ ہے۔

تحسین خوشنویس بھی تھے۔ حسب ذیل کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

نوطرز مرصع ۱۷۹۸ء جنرل اسمتھ کی فرمائش پر قصہ چار درویش کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا، زبان دقیق اور رنگین ہے، عربی فارسی الفاظ، تشبیہات و استعارات کی بہتات ہے۔ نوطرز مرصع کے علاوہ انشائے تحسین، تواریخ فارسی اور ضوابط انگریزی بھی تحسین نے لکھیں۔

یورپین مصنفین اُردو

۱۔ جان جوشوا کٹیلر جان جوشوا کٹیلر سنہ ۱۷۱۱ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر مقرر ہو کر ہندوستان آئے۔ تین سال تک سورت میں مقیم رہے انھوں نے "صرف و نحو ہندوستانی" کے نام سے اُردو زبان کی قواعد سنہ ۱۷۱۵ء میں لکھی۔ یہ کتاب لاطینی زبان میں ہے۔ ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن رسم خط میں تھا۔ زبان صاف اور آسان ہے

۲۔ پادری بنجمن شلز نے اُردو زبان کی قواعد لاطینی زبان میں لکھی جو سنہ ۱۷۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اُردو کے الفاظ فارسی رسم خط میں ہیں اور سنہ ۱۷۴۸ء میں بائبل کا اُردو ترجمہ کیا۔

۳۔ مل نے سنہ ۱۷۴۴ء میں ہندوستانی حروف تہجی پر ایک مختصر کتاب لکھی۔

۴۔ جی۔ اے فرٹز نے سنہ ۱۷۴۸ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اُردو کے حروف تہجی کا دوسرے ممالک کی زبانوں کے حروف سے مقابلہ کیا۔

۵۔ ہیڈلے نے سنہ ۱۷۷۲ء میں اُردو کی گرامر لکھی۔

۶۔ سنہ ۱۷۷۸ء میں ایک اردو کی قواعد "گرینکا اندوستانا" کے نام سے پرتگال میں شائع ہوئی۔

۷۔ ڈف نے سنہ ۱۷۸۰ء کے بعد ہندوستانی گرامر لکھی۔

۸۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے متعدد کتابیں لکھیں ان کا ذکر مصنف کے حالات میں ملے گا۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اردو نثر کے بانیوں میں ہیں۔

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ انھوں نے ۱۷۷۸ء سے اُردو کی خدمت کرنا شروع کی۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل مقرر ہونے کے بعد ان کی توجہ اور زیادہ ہوگئی۔ کالج میں ایک شعبہ ترجمہ و تالیف کا قائم کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اردو کی کتابیں خود لکھیں اور اہل علم حضرات کو جمع کرا کے کتابیں لکھوائیں۔ ان کی سرپرستی، توجہ اور کوشش سے اُردو نثر میں ایسا لٹریچر پیدا ہو گیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے تھی اور نہ اس کے بعد ہو سکی۔ ڈاکٹر صاحب صرف چار برس کالج کے پرنسپل رہے ۱۸۰۴ء میں پنشن لے کر ولایت چلے گئے، وہاں بھی مشرقی زبانوں سے لگاؤ قائم رہا۔ ۱۸۱۸ء میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا اس میں ڈاکٹر صاحب اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہ ادارہ ۱۸۲۵ء میں بند ہو گیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اردو تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۴۱ء میں اس محسن اُردو نے بعمر ۸۲ سال پیرس میں انتقال کیا۔ گلکرائسٹ نے متعدد کتابیں لکھیں۔

۱۔ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری — ۱۷۹۳ء
۲۔ ہندوستانی گرامر — ۱۷۹۶ء
۳۔ اورینٹل لنگوسٹ (مشرقی زباں داں) — ۱۷۹۸ء
۴۔ خلاصہ مشرقی زباں داں مع اضافہ — ۱۸۰۰ء
۵۔ فارسی فعل کا نظریۂ جدید مع تراجم ہندوستانی — ۱۸۰۱ء
۶۔ قصص مشرق (انگریزی سے ترجمہ) — ۱۸۰۳ء

۷۔ رہنمائے زبان اردو ۱۸۰۴ء

۸۔ ہندی عربی کا آئینہ ۱۸۰۴ء

۹۔ قواعد اردو ۱۸۰۹ء

۱۰۔ اردو رسالہ گلکرائسٹ ۱۸۲۰ء

۱۱۔ انگریزی ہندوستانی بول چال مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

میر امن دہلوی میر امن دہلی کے رہنے والے تھے دلی کی ٹکسالی زبان ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شعر و شاعری سے بھی طبعی مناسبت تھی دہلی اجڑ جانے کے بعد پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے پہلے نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق مقرر ہوئے اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں جگہ مل گئی۔ اور سنہ ۱۸۰۱ء میں قصہ چار درویش کو سلیس اردو میں لکھنا شروع کیا جو سنہ ۱۸۰۲ء میں ختم ہوا اور سنہ ۱۸۰۴ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس سے قبل میر عطا حسین خاں تحسین نے نوطرز مرصع کے نام سے ترجمہ کیا تھا لیکن زبان سخت تھی۔ میر امن نے بقول ڈاکٹر عبدالحق نوطرز مرصع کی زبان کو سامنے رکھ کر باغ و بہار لکھی۔ اس کی زبان اس قدر صاف سادہ آسان، سلیس اور بامحاورہ ہے کہ آج تک اس کا جواب نہیں ہو سکا۔ البتہ کہیں کہیں عوام میں رائج ہونے کی وجہ سے غیر مانوس الفاظ بھی استعمال ہو گئے ہیں۔ میر امن کی باغ و بہار، ڈیڑھ سو برس سے زیادہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اسی طرح مقبول و مشہور ہے۔ اس کے سادہ اسلوب میں بلا کی دلکشی اور جاذبیت ہے اس کتاب میں قصہ کہانی کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ہندوستانی روایات اور رسم و رواج کو میر امن نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ فرانسیسی، پرتگالی اور لاطینی زبان میں ترجمہ کی جا چکی ہے۔ میر امن کی دوسری کتاب "گنج خوبی" (سنہ ۱۸۰۲ء) انوار سہیلی کا ترجمہ ہے۔

سید حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش حیدری، سید ابوالحسن کے بیٹے، دلی کے رہنے والے تھے۔ نشوونما بنارس میں ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کی شہرت سن کر انھوں نے ایک کتاب لکھ کر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی خدمت میں پیش کی ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو بیحد پسند کیا اور فوراً حیدری کو بلا کر جگہ دیدی۔

حیدری فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مولف ہیں۔ انھوں نے بہت سی فارسی کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان کی کتابوں کے اکثر ترجمے ہندوستانی اور یورپین زبانوں میں بھی ہوئے۔ انھوں نے حسب ذیل کتابیں لکھیں،

۱۔ قصہ مہر و ماہ	سنہ ۱۷۹۲ء	یہ کتاب نایاب ہے۔
۲۔ گلشن ہند	سنہ ۱۸۰۰ء	شعرائے اردو کا تذکرہ۔ یہ بھی نایاب ہے۔ انگلستان میں اس کی دو کاپیاں موجود ہیں۔
۳۔ قصہ لیلیٰ مجنوں	سنہ ۱۸۰۰ء	امیر خسرو کی مثنوی کا اردو ترجمہ
۴۔ طوطا کہانی	سنہ ۱۸۰۱ء	اصلی کتاب سنسکرت میں تھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور فارسی سے اردو میں حیدری نے کیا۔
۵۔ آرائش محفل	سنہ ۱۸۰۲ء	یہ حاتم طائی کا ترجمہ ہے۔ حیدری نے ترمیم اضافہ بھی کیا ہے جس سے کتاب دلچسپ ہوگئی۔
۶۔ ہفت پیکر	سنہ ۱۸۰۵ء	نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا ترجمہ ہے۔
۷۔ تاریخ نادری	سنہ ۱۸۰۹ء	جہاں کشائے کا اردو ترجمہ ہے۔
۸۔ گل مغفرت	سنہ ۱۸۱۲ء	روضۃ الشہداء کا اردو ترجمہ ہے
۹۔ گلزار دانش	ــــ	فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا ترجمہ ہے۔

۱۰۔ گلدستہ حیدری۔ متفرق تالیفات تراجم جس میں حکایات، لطائف، غزلیات، قصائد وغیرہ شامل ہیں۔

میر شیر علی افسوس

میر شیر علی افسوس دہلی میں ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد میر مظفر خاں کے ہمراہ پٹنہ گئے اور وہاں سے لکھنؤ۔ نہایت ذہین و ذکی اور قابل تھے شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ کرنیل اسکاٹ افسوس کی قابلیت کا بیحد معترف ہو گیا اور دو سو روپیہ ماہوار پہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ بھیجدیا۔ کالج پہنچکر بہت جلد ان کی قابلیت کا شہرہ ہو گیا۔ انھوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں۔ گلستاں کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں باغ اردو کے نام سے کیا۔ زبان میں صفائی اور سلاست کا خاص خیال رکھا کہیں کہیں اردو میں فارسی جملوں اور محاوروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔

دوسری کتاب آرائش محفل ہو ۱۸۰۵ء کے ہندوستان کے تاریخی و جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے انگریزی ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔ کتاب کی زبان اور عبارت صاف ہے۔ واقعات کی صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

افسوس نے ایک اور اہم کام کیا۔ سودا کے کلیات کو صحیح کر کے دوبارہ شائع کیا۔ انھوں نے اپنی یادگار میں ایک دیوان بھی چھوڑا ہے۔ افسوس کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہو گیا۔

مرزا علی لطف

مرزا علی لطف کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان ایسے آئے کہ پھر واپس نہیں گئے۔ مرزا علی لطف کی تعلیم و تربیت وہاں ہوئی۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ان کو بھی فورٹ ولیم کالج میں بلایا تھا اور ان سے شعرا کا تذکرہ تذکرۂ گلشن ہند مرتب کرایا۔ یہ تذکرہ نایاب تھا لیکن حیدرآباد کے طوفان عظیم میں، موسی ندی میں بہتا ہوا پایا گیا۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے تذکرہ

پر اپنا مقدمہ لکھ کر انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کرایا۔ تذکرہ کی عبارت مسجع اور مقفیٰ ہے۔

میر بہادر علی حسینی میرامن کی وساطت سے میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج پہنچے یہ بھی غالباً دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور صاف شستہ زبان لکھتے تھے انھوں نے حسب ذیل کتابیں لکھیں۔

نثر بے نظیر۔ ۱۸۰۲ء مثنوی سحر البیان کا خلاصہ

اخلاق ہندی ۱۸۰۲ء یہ ہتوا پدیش کے فارسی ترجمہ مفرح القلوب کا اُردو ترجمہ ہے۔

تاریخ آسام اور رسالہ گلکرائسٹ بھی حسینی نے لکھا ہے۔

مظہر علی خاں ولا اصل نام مرزا لطف علی تھا مگر مظہر علی خاں کے عرف سے مشہور تھے۔ ان کے والد سلیمان علی خاں وداد فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ مظہر علی خاں کا وطن دلی تھا۔ فارسی، سنسکرت اور ہندی کے عالم تھے۔ مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج پہنچ کر انھوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

ہفت گلشن، ۱۸۰۲ء۔ ناصر علی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا۔

بیتال پچیسی۔ ۱۸۰۳ء۔ بیتال کی ۲۵ کہانیاں سنسکرت سے ہندی میں ترجمہ ہوئیں۔ ولا نے ہندی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

مادھونل اور کام کندلا ۱۸۰۲ء میں موتی رام کوشیر کی ہندی کتاب کا ترجمہ کیا

۱۸۰۵ء میں تاریخ شیر شاہی اور تزک جہانگیری کا بھی ترجمہ اردو میں کیا۔

اردو میں ولا کا ایک دیوان بھی تھا جو نایاب ہے

مرزا کاظم علی جوانؔ مرزا کاظم علی جوانؔ دہلی کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی، شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ کرنیل اسکاٹ نے سنہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ کالج میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں کالیداس کے مشہور ڈرامہ شکنتلا جکو ۱۸۰۱ء میں اُردو ترجمہ کیا بہت مشہور ہے۔ یہ صاف اور سلیس زبان میں ہے۔ کہیں کہیں جوانؔ نے اپنے اشعار کا استعمال کر کے لطف بڑھا دیا ہے۔ دوسری کتاب بارہ ماسہ ہے، جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے۔ تیسری کتاب تاریخ فرشتہ کے ایک حصہ کا اُردو میں ترجمہ ہے۔

ان کے علاوہ جوانؔ نے قرآن پاک کے اُردو ترجمے بھی درست کیے۔ شعراء کے کلیات کا انتخاب بھی کیا اور مولوی حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز پر نظر ثانی کی۔

شیخ حفیظ الدین شیخ حفیظ الدین کے والد شیخ بلال الدین کلکتہ کے ہندو کالج میں مدرس تھے۔ حفیظ الدین نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی، تکمیل تعلیم کے بعد ڈاکٹر گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں مدرسی پر تقرر کر دیا، ڈاکٹر صاحب کی فرمائش پر تصنیف و ترجمہ کا کام بھی کیا، کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ریذیڈنٹ دہلی کے میر منشی ہو گئے۔ ان کی صرف ایک کتاب یادگار ہے۔

خرد افروز مطبوعہ سنہ ۱۸۰۰ء شیخ ابوالفضل علامی کی کتاب عیار دانش کا اُردو ترجمہ ہے اس کا طرز بیان اور زبان صاف اور سادہ ہے۔ نثر بامحاورہ ہے۔ اور تکلفات سے خالی ہے۔

مولوی اکرام علی اخوان الصفا، بصرہ کی ایک انجمن تھی جس کی طرف سے متعدد رسالے مختلف علمی مباحث پر شائع ہوئے۔ مولوی اکرام علی نے

۱۸۰۹ء میں رسائل اخوان الصفا" کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ۱۸۱۰ء میں ان کو پہلی مرتبہ شائع کیا گیا، مولوی صاحب نے حاصل مطلب کو اردو محاورہ میں لکھا اور خطبوں کو نکال ڈالا ترجمہ شستہ اور سلیس زبان میں ہے۔ عبارت عام فہم اور اردو نثر کا اچھا نمونہ ہے۔

نہال چند لاہوری نہال چند دلی کے رہنے والے تھے لاہور میں سکونت اختیار کر لینے کی وجہ سے لاہوری مشہور ہو گئے۔ کپتان ولورٹ کی سفارش سے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے کالج میں جگہ دی۔ انھوں نے فارسی کے مشہور قصہ تاج الملوک اور بکاولی کو ۱۸۰۳ء میں مذہب عشق کے نام سے اردو میں لکھا۔ یہ ترجمہ اصل کے مطابق ہے اس میں شاندار الفاظ اور فارسی ترکیبیں بکثرت ہیں لیکن کہیں کہیں ہندی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔

بینی نرائن جہاں بینی نرائن کے والد مہاراجہ لکشمی نرائن رئیس لاہور تھے۔ بڑے ناز و نعم سے پلے، امارت کے ساتھ ساتھ علم کی دولت بھی پائی تھی، گردش روزگار نے تباہ و برباد کر دیا۔ تلاش معاش میں کلکتہ پہنچے۔ کچھ عرصہ تک بیکار رہنے کے بعد سید حیدر بخش حیدری کی وساطت سے کالج میں ملازمت مل گئی۔ حسب ذیل کتابیں یادگار ہیں۔

۱۔ چار گلشن۔ ۱۸۱۱ء میں یہ قصہ عشقیہ ہے

۲۔ دیوان جہاں۔ ۱۸۱۲ء میں ۱۲۵ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔

۳۔ تنبیہ الغافلین۔ یہ شاہ رفیع الدین دہلوی کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔

للولال جی گجراتی برہمن تھے بچپن ہی میں شمالی ہندوستان آگئے
للولال جی تھے سنسکرت اور ہندی کے عالم تھے اور صاف ستھری زبان لکھتے تھے
اردو بھی بخوبی جانتے تھے۔ اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج نے اُن کی خدمات حاصل کیں۔
یہ اُردو والوں کو ہندی سے ترجمے کرنے میں مدد دیتے تھے انھوں نے ہندی کی کتابیں
بھی لکھی ہیں۔ اردو میں سنگھاسن بتیسی ان کی یادگار رہے جو اُردو ہندی دونوں
رسم الخط میں سیکڑوں بار شائع ہو چکی ہے۔

مولوی امانت اللہ شیدا عربی زبان کے اچھے عالم تھے
مولوی امانت اللہ شیدا تصنیف و تالیف کا شوق تھا، فورٹ ولیم کالج سے
پہلے انھوں نے عربی میں ہدایت الاسلام لکھی تھی یہ فقہ کی کتاب تھی اس کا ترجمہ بھی اُردو
میں کیا۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے عربی فارسی کی مشکل کتابوں کے ترجمے کے لئے رکھ لیا جب یہ
تصانیف ان کی یادگار رہیں۔

۱۔ ہدایت الاسلام دو جلد — ۱۸۰۴ء میں پہلی جلد شائع ہوئی۔
۲۔ ترجمہ قرآن مجید — نامکمل ترجمہ ہے۔
۳۔ جامع الاخلاق ۱۸۰۵ء — اخلاق جلالی کا اردو ترجمہ۔ ترجمہ لفظی ہے۔ عبارت میں تعقید اور پیچیدگی بھی ہے۔
۴۔ صرف اُردو منظوم — اردو صرف کے قواعد مثنوی کی صورت میں نظم کیے ہیں

خلیل علی خاں اشک نے ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی فرمائش
خلیل علی خاں اشک پر داستان امیر حمزہ اردو میں لکھی۔ اس کا طرز بیان
سادہ و سلیس ہے کہیں کہیں رنگین مقفیٰ فقرے بھی لکھے ہیں اور صنائع بدائع، تشبیہات
و استعارات کا بھی استعمال کیا ہے لیکن دلچسپی قائم رکھی ہے۔ اگرچہ اشک نے فارسی قصہ

سے داستان مرتب کی ہے لیکن اس میں ہندوستانی رسم و رواج اور مناظر کو داخل کر لیا ہے
دوسری کتاب واقعات اکبر ۱۸۰۹ء میں لکھی یہ کتاب ابوالفضل کے اکبر نامہ کا
ترجمہ ہے اس کو کپتان ولیم ٹیلر کی فرمائش سے لکھا تھا۔

مرزا جان طپش اصل نام مرزا احمد اسمٰعیل تھا۔ مرزا جان کے لقب سے مشہور تھے۔
۱۷۷۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے عربی فارسی اور سنسکرت کے
عالم تھے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ پہلے لکھنؤ
آئے پھر بنگال گئے۔ اور وہاں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خاں کے ملازم ہو گئے۔
نواب صاحب کی فرمائش سے ۱۷۹۳ء میں اردو محاورات کی لغت تیار کی جس کا نام
شمس البیان فی مصطلحات ہندوستانی رکھا۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج سے وابستہ
ہو گئے یہاں انھوں نے میر حسن کی مثنوی کی تقلید میں ایک مثنوی "بہار دانش" لکھی اپنا
دیوان بھی مرتب کیا جو کالج کی طرف سے شائع ہوا طپش دوسرے لکھنے والوں کو مشورہ
اور مدد بھی دیتے رہتے تھے۔

ان کے علاوہ حمید الدین بہاری نے کھانے اور مٹھائیاں تیار کرنے کی ترکیب پر
خوان الوان لکھی مرزا احمد فطرت نے انجیل کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا۔ محی الدین فیض نے
پند نامہ عطار کا منظوم ترجمہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر

فورٹ ولیم کالج کے علاوہ بھی یورپین اور ہندوستانی مصنفین دونوں نثر کی
طرف متوجہ رہے۔ یہاں ۱۸۵۷ء تک کے چند مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

یورپین مصنفین کی تعداد خاصی ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے بعد
یورپین مصنفین کپتان جوزف ٹیلر نے اردو انگریزی لغت لکھی جو ۱۸۰۸ء میں
شائع ہوئی، گلیڈون نے۔ فارسی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی۔ کپتان رونبک نے
زبان اردو کی قواعد پر ترجمان ہندوستانی" لکھی۔ جان شکسپیر نے اردو لغت لکھی
اور منتخبات ہندی دو جلدوں میں مرتب کی۔ ولیم ییٹ نے مقدمہ زبان ہندوستانی
لکھا اس کے تین حصے ہیں۔ قواعد، لغت، زباندانی۔ ڈنکن فاربس نے ہندوستانی لغت
لکھی۔ ایف فیلن نے مولوی کریم الدین دہلوی کی اعانت سے شاعروں کا تذکرہ شعرائے
ہند کے نام سے مرتب کیا۔ ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے لغات کی چار کتابیں لکھیں۔
ان سب سے زیادہ پروفیسر گارساں دتاسی اردو کا عاشق اور مصنف تھا۔ اس نے
پیرس میں اردو کے متعلق متعدد لکچر دیئے اور بہت سی کتابیں لکھیں، فرانسیسی مضامین ترتیب
دے کر شائع کئے۔ دتاسی نے فارسی۔ عربی۔ سنسکرت، اردو، ہندی کی بیش بہا خدمت
کی ہے۔ سترہ سے زیادہ اردو کی کتابیں لکھیں جن میں تذکرہ شعرائے اردو تین جلدوں میں ہے اس
تذکرہ میں تین ہزار اردو ہندی شعرا اور مصنفین کا ذکر ہے۔ میر تقی میر اور ولی کے کلام کا انتخاب
تذکرہ مصنفین و تصانیف اردو، خطبات متعلق زبان اردو ۱۸۵۰ء تا ۱۸۷۷ء نہایت وسیع
ہیں دتاسی ہر سال اردو زبان پر مفید اور معلوماتی خطبہ دیا کرتا تھا۔
ولیم میکفرسن نے ۱۸۵۰ء میں ایک قانونی کتاب دستور العمل
عدالت دیوانی مرتب کی۔
یورپین مصنفین نے زیادہ تر کتابیں قواعد، لغت اور زباندانی کے
متعلق لکھیں یہ سب کتابیں ۱۸۲۰ء سے لے کر ۱۸۷۰ء تک شائع ہوگئیں۔

ہندستانی مصنفین

سید انشاء: سید انشاء نے نثر میں دو کتابیں دریائے لطافت اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی لکھیں دریائے لطافت ۱۸۰۲ء میں لکھی تھی ۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے پہلا حصہ انشاء نے لکھا ہے دوسرا حصہ مرزا قتیل نے پہلا حصہ بہت دلچسپ ہے ۔ صرف و نحو کے علاوہ ہر طبقہ کی بول چال اور رسم و رواج کا بھی ذکر ہے ۔ الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کی تحقیق کی گئی ہے اور لفظوں کی صحت و فصاحت کے اصول لکھے ہیں ۔ دوسرے حصہ میں قتیل نے منطق، عروض وغیرہ کا ذکر کیا ہے ۔ انشاء کی دوسری کتاب رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی ہے جو ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی ۔ انشاء نے اس کتاب میں ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا، عبارت صاف اور رواں ہے ۔

فقیر محمد خاں گویا متوفی سنہ ۱۸۵۰ء: نواب فقیر محمد خاں گویا، شیخ ناسخ کے شاگرد تھے ۔ صاحب دیوان تھے لیکن ان کا نام بستان حکمت کی وجہ سے زندہ ہے ۔ یہ فارسی کی مشہور کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ ہے جس کو ۱۸۳۵ء میں کیا تھا ۔ عبارت اور زبان اس عہد کے بموجب مسجع اور مقفیٰ ہے ۔ عربی اور فارسی اشعار اور ضرب الامثال کا ترجمہ نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے عبارت مشکل ہو گئی ۔ اکثر الفاظ بھی ثقیل ہیں لیکن زبان خوشنما، دلچسپ اور پر معنی ہے ۔

مرزا رجب علی بیگ سرور: مرزا رجب علی بیگ سرور ۱۷۸۷ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا، عربی فارسی کی تعلیم کافی تھی موسیقی و خوشنویسی میں ماہر تھے زندہ دل، خوش فکر، خوش پوشاک، خوش مزاج اور ظریف الطبع انسان تھے، شعر و سخن سے دلچسپی تھی، آغا نوازش حسین کے شاگرد ہوئے ۔ سرور کو غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا ۔ جلا وطنی کا زمانہ

کان پور میں گزرا اور یہیں فسانہ عجائب لکھنا شروع کی۔ واجد علی شاہ نے سرور کو درباری شاعر مقرر کیا اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کردی۔ اختتام سلطنت کے بعد سرور سخت پریشان رہے اور مختلف مقامات کے سفر کیے۔ مہاراجہ بنارس، مہاراجہ الور، مہاراجہ پٹیالہ نے سرور کی سرپرستی کی، ۱۸۶۲ء میں بغرض علاج چشم کلکتہ گئے اور واجد علی شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ وہاں سے بنارس واپس آئے اور وہیں ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا۔ حسب ذیل کتب سرور کی یادگار ہیں۔

۱۔ فسانہ عجائب ۱۸۲۴ء

۲۔ سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی۔ ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کے حکم سے مرتب کی۔

۳۔ شرر عشق ۱۸۵۶ء میں بیگم بھوپال کے حکم سے لکھا

۴۔ شگوفہ محبت ۱۸۵۶ء میں لکھا

۵۔ فسانہ عبرت امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے حالات میں لکھا

۶۔ گلزار سرور ترجمہ حدائق العشاق فارسی

۷۔ شبستان سرور الف لیلہ کے چند قصوں کا ترجمہ

۸۔ انشائے سرور مرزا سرور کے خطوط کا مجموعہ

سرور کا نام فسانۂ عجائب کی وجہ سے زندہ ہے جس کی عبارت رنگین و مقفیٰ ہے۔ سرور کو حسب موقع زبان اختیار کرنے پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔ فسانۂ عجائب کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ معمولی قصہ کو بھی ایک اچھا انشا پرداز کتنا دلکش و رنگین اور دلچسپ بنا سکتا ہے۔

مولانا غلام امام شہید غلام امام شہید قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شاہ غلام محمد تھا۔ شعر و ادب سے قلبی تعلق تھا نظم میں قتیل اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ فارسی میں کامل دستگاہ تھی۔ الہ آباد میں پیشکار

تھے لیکن نواب رام پور اور نظام حیدر آباد بھی بڑی عزت کرتے تھے۔ نظام دکن
چار سو تیس روپیہ سالانہ وظیفہ بھی دیتے تھے۔

شہید نے اپنا کلام کبھی جمع نہیں کیا جو کچھ محفوظ رہا وہ، مجموعہ میلاد شریف، انشائے
بہار بے خزاں اور چند قصائد و غزلیات ہیں۔

شہید کی تحریر میں بلا کی موزونیت و موسیقیت، رنگینی اور دلکشی، سلاست اور
دلچسپی ہے۔ اسلوب بیان شاعرانہ ہے، جس سے زور و اثر بڑھ گیا ہے۔ خطوط اور
تاج گنج کے روضہ پر مضمون ان کی انشاء پردازی کے بہترین نمونے ہیں۔

غلام غوث بے خبر، خواجہ حضور اللہ کے صاحبزادے تھے

غلام غوث بیخبر بزرگوں کا وطن کشمیر تھا لیکن بیخبر کے والد ترک وطن
کرکے تبت اور وہاں سے نیپال چلے آئے۔ بے خبر وہیں ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے
چار برس کے بعد والد کو نیپال چھوڑ کر بنارس آنا پڑا، بے خبر کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی
۱۸۴۰ء سے ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے
نائب منشی ہوئے اس کے بعد میر منشی کے عہدہ پر مقرر ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں پنشن لی
۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ مرزا غالب اور بیخبر سے دوستانہ تعلقات تھے۔

بے خبر کی عبارت میں رنگینی اور تصنع ہے۔ رعایت لفظی اور مبالغہ، تشبیہہ اور
استعارہ کے استعمال کا بہت شوق ہے البتہ قوافی اور سجع کا التزام نہیں کرتے ہیں
بیخبر کی یہ تصانیف یادگار ہیں۔ خمخانۂ جگر، فغان بے خبر، انشائے بے خبر۔

مولوی اسمعیل، شاہ عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ کے

مولوی اسمعیل دہلوی پوتے تھے ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز
کی آغوش میں تربیت پائی تکمیل علم کے بعد مولوی سید احمد بریلوی کے مرید ہوگئے ان کے

ساتھ ۱۸۲۶ء میں پشاور گئے۔ ۱۸۲۹ء میں پشاور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۳۱ء میں قلعہ بالاکوٹ کے قریب سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ مولوی اسمٰعیل شہید نے اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں تقویت الایمان بہت مشہور ہے۔ جس کی زبان صاف اور سلیس ہے، کہیں کہیں ترتیب الفاظ اور انداز بیان میں قدامت پائی جاتی ہے۔

مفتی صدرالدین آزردہ مفتی صدرالدین آزردہ ۱۷۹۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے والد کا نام مولوی لطف اللہ کشمیری تھا۔ مشاہیر علماء سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کیے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی میں صدر الصدور رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اسیر فرنگ ہوئے جائداد ضبط کی گئی بعد میں رہائی پائی اور جائداد کا کچھ حصہ بھی واپس مل گیا۔ تعلیم و تدریس کا بیحد شوق تھا۔ عربی فارسی کی چند کتابیں یادگار ہیں اردو میں مفتی صاحب کے صرف خطوط ہیں جو انھوں نے مرزا غالب، شیفتہ، صہبائی وغیرہ کو لکھے تھے۔ زبان میں قدامت کا رنگ نمایاں ہے۔

امام بخش صہبائی امام بخش صہبائی دہلی کے رہنے والے اور فارسی کے زبردست عالم اور محقق تھے۔ دہلی کالج کے پروفیسر ۱۸۵۷ء سے پہلے تک رہے، مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صہبائی کو بغاوت کے الزام میں مہذب نادر ندوں (انگریزوں) نے قتل کر دیا اور مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے کہا

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی نے ۱۸۴۲ء میں حدائق البلاغت کا اردو ترجمہ کیا۔ جو ۱۸۴۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ کلیات صہبائی بھی یادگار ہے۔ صہبائی کی زبان صاف ستھری اور ان کا انداز بیان دل کش ہے۔

پروفیسر رام چندر رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے نہایت ذہین محنتی اور قابل تھے۔ ریاضی سے خاص لگاؤ تھا۔ ریاضی میں الجبرا، مثلث، علم ہندسہ، علم الحساب متعدد کتابیں لکھیں۔ ادب میں بھی ان کی کئی کتابیں ہیں جن میں عجائب روزگار اور تذکرۃ الکاملین نہایت وقیع ہیں۔ تذکرۃ الکاملین میں بہت سے یونانی فلاسفروں اور شاعروں کے حالات درج ہیں۔ انھوں نے ریاضی میں ایک نیا مسئلہ دریافت کیا تھا جس کی وجہ سے یورپین ممالک میں ان کی شہرت ہوگئی۔

طرز تحریر نہایت سلیس اور رواں ہے۔ عربی کے الفاظ بھی جابجا استعمال کئے ہیں لیکن زیادہ تر عام فہم اور روزمرہ کے الفاظ ہیں۔

مرزا غالب مرزا غالب کا نثری سرمایہ ان کے خطوط، چند تقاریظ، دیباچے اور رسالے ہیں۔ خطوط کے علاوہ تقاریظ، دیباچوں اور رسالوں کی عبارت قدیم طرز کی نثر یعنی مقفیٰ و مسجع ہے۔ مرزا کو خطوط کی وجہ سے اردو نثر میں منفرد و ممتاز حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مرزا نے ۱۸۴۸ء سے اردو میں خط لکھنا شروع کیے، اور آخر وقت تک ان کی مکتوب نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ اس ۲۰، ۲۱ برس کی مدت میں انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں محسنوں اور بزرگوں کے نام کئی سو خطوط لکھے۔ یہ خطوط اس زمانہ کی سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی، معاشی اور تاریخی حالات کا آئینہ ہیں۔ مرزا کی شخصیت اپنی پوری توانائی کے کے ساتھ ان میں نمایاں ہے۔ یہ خطوط ان کے دل و دماغ اور خیالات و رجحانات کی مکمل تصویر ہیں، زبان و بیان کا حسین و دلکش مرقع ہیں، ان کی زبان سلیس، رواں سادہ اور دلکش ہے۔ لفظ لفظ میں طنز و مزاح کی چاشنی موجود ہے۔ انداز بیان،

شوخ و رنگین ہے، جدّت و ندرت، نکتہ آفرینی و نکتہ سنجی، جزئیات نگاری، منظر کشی، خلوص و بے تکلفی، ان خطوط کی خصوصیت ہے۔ انداز مکالمت اور دقیق علمی و ادبی نکات کا بیان ان کا حُسن ہے۔ مرزا نے خطوط میں نئی راہ نکالی۔

۱۔ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ ختم کر دیا کبھی بہت مختصر القاب لکھتے ہیں، کبھی بالکل غائب کر دیتے ہیں، اسی طرح خط کو نئے طریقے سے ختم بھی کرتے ہیں۔ دعا، سلام، اپنا نام اور تاریخ لکھنے میں بھی جدّت پیدا کرتے ہیں۔

۲۔ مکتوب الیہ کو حاضر سمجھ کر خط اس طرح لکھتے ہیں جیسے باتیں کر رہے ہوں یعنی مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔

۳۔ شوخی تحریر، ظرافت و بذلہ سنجی ان کے ہر خط میں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے حالی نے انھیں حیوان ظریف، کہا جس کی وجہ سے خطوط ناول اور ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ ہو گئے ہیں۔

۴۔ اکثر خطوط تقفیٰ اور مسجع عبارت میں بھی ہیں لیکن انداز تحریر نے ان کو اور زیادہ پر لطف بنا دیا ہے۔

۵۔ مکتوب الیہ کے مرتبہ، مذاق اور اپنے تعلقات کا خیال رکھتے ہوئے خط لکھتے ہیں۔

۶۔ تعزیت بھی کرتے ہیں تو شوخی و ظرافت سے باز نہیں آتے۔

مرزا کی فطری شوخی نئے نئے اسالیب میں جلوہ گر ہوتی ہے ان گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہی مرزا کے خطوط کے سترہ اٹھارہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور غالب کے ان جواہر پاروں کی تلاش اب بھی جاری ہے۔

جدید نثر

مرزا غالب کے خطوط نے اُردو نثر کی صلاحیت کو واضح کر کے مقفیٰ و مسجع نثر کی اہمیت ختم کر دی۔ سر سید احمد خاں و ران کے رفقاء خصوصاً حالؔی، شبلؔی، نذیر احمد وغیرہ نے اُردو نثر کی کایا پلٹ دی، مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی نے نثر کو حسن و جمال دلکشی و رعنائی عطا کی۔ اور نثر اس قابل ہو گئی کہ وہ ہر قسم کے خیالات اور عصری رجحانات کو ادا کر سکے نثر کی تمام تر ترقی انھیں بزرگوں کی مرہون منت ہے۔

موضوع کے اعتبار سے لکھنے والوں کو حسب ذیل عنوانات کے تحت رکھا گیا ہے۔ یہ تقسیم بالکل صحیح اس لیے نہیں ہے کہ ان میں اکثر مشاہیر بیک وقت ادیب، انشاء پرداز، نقاد، مورخ اور صحافی بھی ہیں

نثر کے معمار

ادب، تنقید و لسانیات

مقالات و صحافت

افسانوی ادب، ناول، افسانے، ڈرامے، طنز و مزاح وغیرہ۔

نثر کے معمار

سر سید احمد خاں ۱۸۱۷ء ۱۸۹۸ء

سر سید احمد خاں ۱۸۱۷ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر متقی قناعت پسند، پرہیزگار اور نیک نفس بزرگ تھے۔ ان کی والدہ بھی نہایت نیک سیرت اور روشن دماغ خاتون تھیں۔ سر سید کی تعلیم و تربیت انھیں کی توجہ خاص کا نتیجہ تھی۔

سر سید نے دستور زمانہ کے مطابق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۳۹ء میں دہلی میں سررشتہ داری کے عہدہ پر سرکاری ملازم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اس عہدہ سے ترقی کر کے سب جج ہو گئے۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ کے دربار سے عارف جنگ جواد الدولہ کا خطاب ملا۔

۱۸۵۷ء مسلمانوں کے لیے بالخصوص انتہائی تباہ کن ثابت ہوا۔ ان کا سارا نظام حیات برباد ہو گیا۔ سر سید ایک درد مند دل لے کر آئے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی علمی اخلاقی اور معاشرتی پستی دور کرنے کے لیے اصلاحی کوششیں شروع کیں۔

اس زمانہ میں سر سید کو مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ادارہ کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ ولایت تشریف لے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر مغربی طرز معاشرت اور نظام تعلیم کا بہ غائر مطالعہ کیا۔ ولایت سے واپسی پر رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں جاری کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کی خستہ حالی، جہالت اور قدامت پرستی کا احساس کرایا جائے اور انگریزی تعلیم کا شوق دلا کر نئے افکار و خیالات اور نئی قدروں سے اپنی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ اس رسالے نے مسلمانوں کے دماغی جمود کو توڑا اور ان کے خیالات میں حرکت اور تغیر پیدا کیا۔

سر سید کی اصلاحی کوششوں کی آخری کڑی علی گڈھ مسلم اورینٹیل کالج کا قیام ہے

جو کہ اب ایک اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹی ہے۔ یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا نشاۃ ثانیہ اسی علی گڑھ کالج سے وابستہ ہے۔ اس کالج نے مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے روشناس کرایا اور ان کو ایک نئی تہذیب بخشی جو قدیم مشرقی روایات اور مغرب کی نئی قدروں کے تصادم سے پیدا ہوئی۔ ۱۸۷۶ء میں سرسید نے پنشن لے لی اور اپنا سارا وقت کالج کی ترقی اور قومی کاموں میں صرف کرنے لگے۔ ۱۸۹۸ء میں علیگڑھ میں انتقال کیا اور کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔

سرسید بڑی شخصیت اور کردار کے مالک تھے۔ ان کی ساری زندگی قوم کی اصلاح اور خدمت سے عبارت ہے۔ وہ ایک زبردست مصنّف، بلند خیال مفکّر، جلیل القدر مصلح اور ہوشمند مدبر تھے۔ دنیا کے تمام بڑے آدمیوں کی طرح ان کے اندر بھی مقناطیسی کشش تھی جو شدید مخالفتوں کے باوجود لوگوں کے دلوں کو مسخّر کر لیتی تھی۔ ان کے نظام شمسی کے سارے ستارے روشن اور درخشندہ تھے۔ یہ روشن ستارے محسن الملک، وقار الملک نواب اعظم یار جنگ، مولانا حالیؔ، مولانا شبلیؔ، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان میں سے اگرچہ ہر ایک مستقل شخصیت کا مالک ہے مگر سرسید کی روشنی سے منوّر رہے۔

سرسید کا طرز تحریر تصنع سے پاک، سادہ، واضح اور پُر اثر رہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کی حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تکلّف اور بناوٹ سے کام لے کر عبارت آرائی کی کوشش نہیں ہوتی۔ سرسید نے کام کی زبان میں کام کی باتیں لکھنا سکھایا۔ جو چیز سرسید کو دوسرے صاحب قلم سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی قوت بیان ہے۔ وہ ہر قسم کے موضوع اور مضمون پر کامیابی کے ساتھ قلم اٹھا سکتے ہیں۔ اس صنف میدان کا کوئی شریک نہیں ہے۔

سرسید کی انشا پردازی اپنا جواب نہیں رکھتی ان کے اسلوب بیان اور زبان میں سلاست وروانی عبارت میں دل کشی اور رنگینی اور الفاظ وتراکیب کی عمدہ تراش خراش ملتی ہے۔ وہ زبان وقواعد کے مطیع وپابند نہ تھے اور الفاظ سے طرز بیان میں ندرت ودل کشی پیدا کر دیتے تھے۔ سرسید شاعر بھی تھے اور آہی تخلص رکھتے تھے۔ تصانیف میں آثار الصنادید، خطبات احمدیہ رسالہ اسباب بغاوت ہند وغیرہ مشہور ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین علیحدہ شائع ہو چکے ہیں۔

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم

۱۸۳۲ء ـــ ۱۹۱۰ء

پائی۔ ۱۸۵۰ء میں محکمہ تعلیمات میں ملازم ہو گئے۔ مدت تک صیغہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر سرفراز رہے۔ آخر میں میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پروفیسر ہو گئے۔ وہیں سے ۳۷ سال ملازمت کے بعد ۱۸۸۷ء میں پنشن ملی۔ ۲۴ سال پنشن لے کر ۸۰ برس کی عمر میں ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں وفات پائی۔

مولوی ذکاء اللہ نے اردو زبان کی جس قدر خدمت کی ہے کسی کو کم اتنا موقع ملا ہوگا۔ تہذیب الاخلاق۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علیگڈھ اور مختلف پرچوں میں ان کے مضامین برابر نکلتے رہے۔ آخر دم تک تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ علوم ریاضیہ اور طبیعات میں ان کو خاص مہارت تھی۔ موصوف نے اردو زبان میں ان علوم کا بہت بڑا اور عمدہ ذخیرہ جمع کر کے ایک سلسلہ قائم کر دیا جو کئی شخصوں کی محنت سے بھی باہر تھا۔ موصوف کی حساب جبر ومقابلہ۔ اقلیدس۔ مساحت میں ۲۸ تصنیفات ہیں۔ جو شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۰۔ علم طبعیات میں ۱۴۔ جغرافیہ میں ۳۔ ہندوستان کی ایک مکمل تاریخ دس جلدوں میں لکھی جس میں عہد قدیم سے انگریزوں کی

سلطنت کے قیام اور استحکام کے حالات لکھے ہیں۔ علم الاخلاق اور علم ادب میں ۲۲ کتابیں ہیں۔ اردو زبان میں ایسا شخص کم ہوگا جس نے مختلف علوم میں ۱۲۴ کتابیں لکھی ہوں۔

مولانا کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے اُس میں زبان دہلی کی خوبی اور ظرافت کا چٹخارا بھی موجود ہے۔

مولانا کو خصوصیت کے ساتھ ترجمہ کرنے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ کتاب کا ترجمہ ہو جانے کے بعد یہ شناخت کرنا ناممکن تھا کہ کتاب دوسری زبان سے ترجمہ کی گئی ہے یا اصلی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۳۶ء - ۱۹۱۰ء شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اردو کے صاحب طرز اور بے مثل انشا پرداز ہیں، زبان کی سلاست بیان کی لطافت، بندش کی چستی، اور محاورے کی دلآویزی، ظرافت کی چاشنی آزاد کی نثر کا حسن ہے۔

سادگی و بے ساختگی میں تکلف و رنگینی موجود ہے وہ زبان و بیان کے شہنشاہ ہیں۔ ان کی اختراع پسند طبیعت اور جدت پسند دماغ نثر کے چمن میں طرح طرح کے دل کش و رنگین پھول کھلا کر دل کو فرحت و انبساط عطا کرتا ہے اردو فارسی ریڈروں کے علاوہ متعدد کتابیں مشہور ہیں۔ آب حیات، نیرنگ خیال (دو حصے) دربار اکبری، سخندان پارس اردو ادب کے بیش بہا موتی ہیں۔

آزاد جدید نثر کے بھی بانی ہیں اور ادب کی تنقید و تاریخ میں بھی ان کا نام سر فہرست ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد مولوی نذیر احمد دسمبر ۱۸۳۶ء میں بمقام موضع ریڑ ضلع بجنور پیدا ہوئے ان کے والد مولوی سعادت علی عربی وفارسی کے زبردست عالم تھے۔ نذیر احمد نے والد بزرگوار سے ہی پڑھنا شروع کیا ۱۸۴۵ء میں مولوی نذیر احمد دہلی کالج میں داخل ہوئے مگر والد کی مرضی کے خلاف ہونے کی وجہ سے انگریزی تعلیم پورے طور پر حاصل نہ کرسکے۔

۱۸۳۶ء۔ ۱۹۱۲ء

فارغ التحصیل ہو کر مولوی نذیر احمد گجرات کے ایک اسکول میں معلم ہوئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد کانپور میں ڈپٹی انسپکٹری کے عہدہ پر تعینات ہوئے ۱۸۵۷ء کے بعد اسی عہدہ پر الہ آباد آگئے۔ الہ آباد کے زمانۂ قیام میں انگریزی کی اچھی استعداد بہم پہنچائی اور یکے بعد دیگرے قانون انکم ٹیکس تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں سے مولوی نذیر احمد کی بڑی شہرت ہوئی۔ گورنمنٹ نے انھیں ڈپٹی کلکٹر بنادیا۔ بعد پنشن مولوی نذیر احمد سر سالار جنگ اوّل کی طلبی پر حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں کسی ممتاز عہدہ پر بمشاہرہ ساڑھے آٹھ سو ماہوار فائز ہوئے اس کے بعد ترقی کرکے بورڈ آف ریوینیو کے ممبر ہوگئے۔ اور مشاہرہ سترہ سو روپیہ ماہوار ہوگیا۔ سر سالار جنگ کی وفات پر حیدرآباد سے واپس ہوئے اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ مولوی نذیر احمد کو کئی تصانیف پر گورنمنٹ سے انعامات ملے اور بالآخر اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی اور پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی اعزازی ڈگریوں سے سرفراز کیا۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء میں بمقام دہلی رحلت فرمائی۔

مولوی نذیر احمد کی عربی وفارسی کی علمیت مسلّم تھی۔ ان کی تحریروں سے

اس قابلیت کا اظہار ہوتا ہے ان کی زبان ویسے تو انتہائی سلیس اور رواں ہے مگر کہیں کہیں عربی و فارسی کے الفاظ اور فقرے اس کثرت سے آجاتے ہیں کہ عبارت کی روانی مجروح ہو جاتی ہے۔

مولوی نذیر احمد ہمیشہ روشِ عام سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں اس کے لیے وہ عبارت میں شوخی روزمرہ اور محاورات کی کثرت کا التزام کرتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے اور اس میں روزمرّہ کی پُر لطف چاشنی ہوتی ہے مگر محاورات کا بے محل استعمال اکثر جگہ عبارت میں ابتذال اور بھونڈا پن پیدا کر دیتا ہے نذیر احمد کی انشا پردازی میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ وہ موضوع کے لحاظ سے زبان استعمال نہیں کرتے۔ مذہبی تحریروں اور ترجمہ قرآن شریف میں انھوں نے جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ ممکن ہے کہ قصوں اور حکایتوں میں کام دے جائے مگر مذہبی مسائل پر اظہار خیال کے لیے قطعاً ناموزوں ہے۔

اُردو ادب میں مولوی نذیر احمد دو حیثیت سے ممتاز ہیں اولاً تو وہ اُردو کے سب سے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان ناولوں میں کردار نگاری اور پلاٹ کی کمی کے باوجود مکالمے دلچسپ، برمحل اور موزوں ہیں۔ دوسرے انھوں نے سرسید کی طرح سنجیدہ علمی اور مذہبی مباحث پر قلم اُٹھایا ہے اور عقلی و منطقی طرز استدلال سے کام لیا ہے۔ اس طرز استدلال اور طریقہ بیان سے اُردو زبان نا آشنا تھی۔

مولوی نذیر احمد سرسید کے عناصر خمسہ کے ایک ممتاز رکن ہیں وہ ایک بلند پایہ ادیب اور ناول نگار کی حیثیت سے اُردو ادب میں ممتاز ہیں۔ مولوی نذیر احمد اصلاح معاشرت اور تحفظ حقوق نسواں کے زبردست حامی تھے۔ اُن کی تصانیف میں یہ عقیدہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کی تصانیف میں توبۃ النصوح، مراۃ العروس، ابن الوقت

رویائے صادقہ، بنات النعش، فسانۂ مبتلا، ایامیٰ، ترجمہ قرآن شریف، ادراکحقوق والفرائض وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "نظم بے نظیر" اور لیکچروں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء ۔ ۱۹۱۴ء مولانا حالی صرف ایک بلند مرتبہ شاعر اور جدید شاعری کے امام ہی نہیں بلکہ وہ بہترین نقاد بے مثل سوانح نگار بھی تھے، اردو نثر نگاروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے وہ صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کا انداز بیان سیدھا سادا، واضح، صاف اور سلجھا ہوا ہوتا ہے، سادگی، سلاست، روانی اور تاثیر اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ حالی اپنی خودداری، اور سنجیدگی کو ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔ وہ نظم کی طرح نثر میں بھی "رازداں سے نہیں کھلتے"۔ غیر ضروری رنگ و روغن چڑھا کر خیال کی فطری خوبصورتی کو مسخ نہیں کرتے۔ نثر میں مولانا حالی کے سیدھے سادے اسلوب کو ہی مقبولیت اور زندگی نصیب ہوئی۔

حیات سعدی، یادگار غالب، مقدمہ شعر و شاعری، حیات جاوید اور مقالات حالی، ان کی نثر کی بہترین یادگاریں ہیں

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء ۔ ۱۹۱۴ء علامہ شبلی کی شخصیت جامع صفات تھی وہ بیک وقت ادیب شاعر، معلم، محقق، مورخ، فلسفی، نقاد، خطیب اور مصلح تھے، ان کا ذوق ادب نہایت پاکیزہ اور بلند تھا، زبان و بیان پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی۔ زبان شستہ و پاکیزہ، پیرایہ بیان دلکش و شگفتہ ہے مولانا کی تنقید نگاری اور سوانح نگاری سے اردو ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ ان کی تصانیف ان کے وسیع مطالعہ اور ان کے فطری ذوق کی شاہد ہیں، مولانا کی جدت پسند طبیعت نثر میں بھی اپنے جوہر دکھاتی ہے وہ اپنے نفس مطلب

کو انتہائی حسن و خوبی اور صحت و صفائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان کی تحریر میں عالمانہ رنگ ہونے کے باوجود دلچسپی اور سلامت قائم رہتی ہے وہ بغیر کسی تکلف اور آورد کے تحریر میں رنگینی پیدا کرنے میں کمال رکھتے ہیں نثر میں مولانا نے تنقیدی، ادبی مذہبی تاریخی فلسفیانہ وغیرہ متعدد کتابیں لکھیں جو اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں علمی و تحقیقی مقالات لکھے جو آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم پانچ جلد سیرۃ النبیؐ، الغزالی، الفاروق، سوانح مولانا روم وغیرہ جیسی موقر کتابوں سے شبلی کا نام زندہ جاوید رہے گا۔

نواب محسن الملک مہدی علی خاں ۱۸۳۷ء - ۱۹۰۷ء

مہدی علی اٹاوہ میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے، عربی فارسی کی معمولی تعلیم حاصل کی، لیکن ذوق مطالعہ نے علم و فضل عطا کیا دس روپیہ کی معمولی ملازمت سے ترقی کرتے کرتے حیدرآباد میں اعلیٰ معتمد مال ہو گئے اور تین ہزار روپیہ ماہوار پانے لگے حسن خدمات کی وجہ سے "محسن الدولہ، محسن الملک منیر نواز جنگ" خطاب ملا، ۱۸۹۳ء میں پنشن لے کر علی گڑھ آئے اور بقیہ عمر کالج کے لیے وقف کر دی۔ سرسید کے بعد کالج کے سکریٹری منتخب ہوئے، محسن الملک آزاد خیال، وسیع النظر تھے تقریر و تحریر دونوں میں جادو تھا، انھوں نے بہت سے مضامین لکھے جن میں جوش، توازن، سلاست روانی بیان اور تاثیر موجود ہے کبھی کبھی صنائع بدائع کا بھی استعمال کرتے ہیں ۱۹۰۷ء میں شملہ میں وفات پائی لیکن دفن سرسید کے برابر کئے گئے۔ آیات بینات یادگار ہے۔

مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء - ۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے والدہ اور دادی نے تعلیم و تربیت کی معمولی طور پر

انگریزی فارسی اُردو پڑھی۔ غربت نے ملازمت پر مجبور کیا، اتفاق سے بیس روپیہ
ماہوار پر بستی کے محکمہ خزانہ میں نوکر ہو گئے۔ ذوقِ مطالعہ بیحد تھا، ذہن و حافظہ بھی بلا
کا تھا، تھوڑے ہی دنوں میں عربی فارسی، انگریزی، لاطینی اور یونانی میں مہارت حاصل
کرلی۔ اپنی محنت، قابلیت اور صلاحیت کی بدولت مولوی صاحب بھی حیدرآباد میں معتمد مال
کے جلیل القدر عہدہ پر مقرر ہو گئے۔ پڑھنے لکھنے کا شغل ہمیشہ جاری رکھا۔ بہت سی
کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں۔ تہذیب الاخلاق میں بھی موصوف نے بہت سے مضامین
لکھے۔ عبارت مدلل، سنجیدہ اور متین ہوتی ہے۔ رنگینی و دلکشی کم ہے۔ زیادہ تر مذہبی
کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۵/ جون ۱۸۹۵ء کو بمبئی میں انتقال فرمایا۔

سید علی بلگرامی
۱۸۵۱ء تا ۱۹۱۱ء

سید علی بلگرامی قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی میں ۱۸۵۱ء میں
پیدا ہوئے ان کا خاندان علم و فضل میں مشہور تھا۔ ذہن
و حافظہ بلا کا تھا۔ عربی فارسی، اردو انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، لاطینی، سنسکرت
بنگالی مرہٹی گجراتی، تلنگی اور ہندی زبانوں پر عبور تھا سائنس کی تعلیم کے لیے
یورپ گئے۔ ملکی مصروفیات نے علم و ادب کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ ورنہ اردو
ادب میں موصوف کا ثانی نہیں ہوتا۔ تمدن ہند اور تمدن عرب، فرانسیسی
زبان سے ترجمہ کر کے اپنا نام زندہ جاوید کر گئے۔ یہ ترجمے سلیس بامحاورہ
اور رواں ہیں۔ اصطلاحات کے ترجمے خوب کیے ہیں۔ اور انگریزی الفاظ
کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ ۳/ مئی ۱۹۱۱ء کو وفات پائی

نواب وقار الملک

نواب مشتاق حسین امروہہ کے ایک گاؤں میں پیدا
ہوئے تکمیل تعلیم کے بعد مدرسی کی رفتہ رفتہ حیدرآباد
میں ناظم دیوانی ہوئے۔ اور وقار الدولہ وقار الملک کا خطاب پایا ۱۸۹۱ء میں پنشن

لے کر بقیہ عمر قومی خدمت کے لیے وقف کر دی ۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے رکن تھے ۔ ان کی مشہور کتاب سرگذشت نپولین بونا پارٹ ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی ۔

ادب ، تنقید ، لسانیات

پنڈت برج نرائن چکبست (۱۸۸۲ء — ۱۹۲۶ء)

چکبست ایک اچھے شاعر اور ایک عمدہ انشا پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں ۔ ان کی نثر شگفتہ اور دلچسپ ہوتی ہے ان کی زبان صاف شستہ اور شیریں ہے ۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف الفاظ اور عام بول چال میں ادا کرتے ہیں ۔ نثر میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے صداقت اور خلوص ہر ہر فقرہ سے ٹپکتا ہے ، کلام میں اثر پایا جاتا ہے ۔ الفاظ مناسب با محاورہ اور زوردار استعمال کرتے ہیں اس سے ان کے کلام کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے ۔ ان کی نثر میں مناسبت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے معرکہ شرر و چکبست میں چکبست کے قلم نے خوب خوب گل افشانیاں کی ہیں ۔ چکبست کے مضامین کا نامکمل مجموعہ "مضامین چکبست" کے نام سے شائع ہو چکا ہے

وحید الدین سلیم پانی پتی (۱۸۶ء — ۱۹۲۸ء)

وحید الدین سلیم کا طرز تحریر سلیس زوردار اور معنی خیز ہوتا ہے ۔ ہندی زبان کے شیریں اور سریلے الفاظ استعمال کرتے ہیں تخلیق زبان اور وضع اصطلاحات کا بے حد شوق تھا ۔ تلسی داس کی شاعری اور عرب کی شاعری پر موصوف نے نہایت محققانہ مقالات لکھے افادات سلیم اور وضع اصطلاحات ان کی یادگار ہیں ۔ مولانا حالی کے انداز تحریر سے بہت متاثر ہیں ۔

محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی ۱۸۸۱ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے ۱۸۸۱ء ۔ ۱۹۴۶ء ۱۸۹۵ء میں منشی فاضل پاس کیا ۔ اردو فارسی کے پروفیسر پہلے اسلامیہ کالج لاہور میں (۱۹۲۱ء) ہوئے اس کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۰ء میں ریٹائرڈ ہو گئے اور ۱۵ر فروری ۱۹۴۶ء میں وفات پائی ۔

محمود شیرانی کو علمی تحقیقات کا شوق بے حد تھا ۔ بیسیوں تحقیقی مقالے لکھے ہزاروں مخطوطات جمع کئے ، جو اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ملکیت ہیں ۔ عروض پر عبور حاصل تھا ۔ اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہر لسانیات تھے ۔ پنجاب میں اردو موصوف کی تحقیقی اور لسانی تصنیف ہے ۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی علامہ کیفی اردو کے زبردست حامی تھے اور اردو کو بین الاقوامی زبان سمجھتے تھے ۔ کیفی کے صدارتی مقالات ، تحقیق اور استدلال کا خزانہ ہیں ۔ کیفیہ کا محققانہ طرز بیان اور بحث و مباحثہ نہایت اہم ہے ۔ کیفی نے دو ایک سوشل ڈرامے بھی لکھے ہیں جو فنی اعتبار سے اعلیٰ تسلیم کئے گئے ہیں ۔ کیفی کا طرز تحریر سنجیدہ اور متین ہے ۔ کہیں کہیں شوخ بھی ہو جاتا ہے لیکن خیالات میں پاکیزگی اور زبان بامحاورہ ہے ۔ مختصر یہ کہ کیفی بہترین نقاد ، اچھے شاعر ، سوشل ڈرامہ نگار ، بلند پایہ ادیب اور محقق تھے اور اردو ہندی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے لسانی معاملات کو مذہب اور سیاست سے بالاتر سمجھتے تھے

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق قصبہ ہاپڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے ۔ شروع ۱۸۷۰ء ۔ ۱۹۶۱ء میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد علیگڈھ

کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک پنجاب میں رہے اس کے بعد حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے کچھ دنوں کے بعد عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل مقرر ہوئے یہیں انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے پہلے بنیادی سکریٹری منتخب ہوئے سنہ ۱۹۳۰ء میں جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں اردو کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ انجمن کی طرف سے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ "اردو" اور ایک رسالہ "سائنس" نکالا۔ مولانا کو ادبی خدمت کے صلے میں الہ آباد یونیورسٹی نے ایل ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ مولانا نے اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی سے کراچی منتقل ہو گیا۔ وہاں بھی مولانا آخر عمر تک سکریٹری رہے۔ ۱۶ اگست سنہ ۱۹۶۱ء بعمر ۹۱ سال مولانا نے انتقال فرمایا۔

مولانا عبدالحق موجودہ دور کے سب سے بڑے ادیب اور نقاد ہیں۔ زبان پاکیزہ و مستند۔ انداز بیان صاف و سادہ اور طرز تحریر بہت ہی سلیس و دلکش ہے۔ عبارت پُر زور اور پختہ ہوتی ہے۔ مطلب کو اختصار اور صفائی کے ساتھ بیان کرنے کی خاص صلاحیت ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سے عبارت پُر لطف اور دلچسپ ہو جاتی ہے۔ ہندی الفاظ کا استعمال مناسب اور برجستہ ہوتا ہے مولانا کی نثر پر مولانا حالی کا اثر زیادہ ہے۔ مولانا نے سیکڑوں مقدمات لکھے ہیں۔ اور سیکڑوں مخطوطات کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ مقدمات عبدالحق، تنقیدات عبدالحق، چند ہم عصر، انتخاب کلام میر۔ اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ مولانا کی یادگار ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب سید مسعود حسن رضوی ادیب ۲۹ جولائی سنہ ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں کیننگ کالج سے

بی۔ اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء سے محکمہ تعلیم میں ملازمت کرلی۔ فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ تحصیل علم بھی کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں جونیر لیکچرار مقرر ہوئے ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے (فارسی) اول درجہ میں پاس کیا۔ پہلے لیکچرر، پھر ریڈر اور اس کے بعد پروفیسر ہوگئے۔ ۱۵ر جون ۱۹۵۴ء کو ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد کتاب نگر ادبستان میں، اردو کی خدمت کے لیے پورا وقت وقف کیے ہوئے ہیں۔ آپ کے کتب خانہ میں نادر و نایاب کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مسعود صاحب پرانی تہذیب کے دلدادہ اور خلوص و محبت کے مجسمہ ہیں، زبان صاف، شستہ، پاکیزہ۔ حوض کوثر سے دھلی ہوئی، لکھنوی نہ ہونے کے باوجود لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر قادر ہیں۔ سلاست و روانی دلکشی و شیرینی کے ساتھ ساتھ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی بناوٹ سے ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔ صحت زبان کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ انداز بیان، سنجیدہ اور شگفتہ ہے۔ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ مراثی اور واجد علی شاہ اور اردو ڈرامے پر آپ کی تحقیقات کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے آپ کی تصانیف نہایت وقیع ہیں صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی طرف سے آپ کو انعامات بھی مل چکے ہیں۔ تصانیف میں ہماری شاعری شاہکار انیس، روح انیس، فیض میر، کلیات فائز دہلوی، فرہنگ امثال لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، رزم نامۂ انیس وغیرہ کافی مشہور و مقبول ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۸۹۹ء

۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں برلن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ علمی و ادبی ذوق فطری ہے۔ اردو، جرمنی اور انگریزی زبانوں پر یکساں قادر ہیں۔ تاریخ، فلسفہ، اسلام اور نفسیات کی [illegible]وں کے ترجمے کئے ہیں گاندھی جی کی کتاب کا ترجمہ "تلاش حق" اور جرمن شاعر گوئٹے کے ڈرامہ

"فارسٹ" کا کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ ڈرامہ نگاری اور افسانہ نویسی میں بھی آپ کو کمال حاصل ہے۔ آپ کی تحریر شگفتہ، متوازن ہوتی ہے، قلم میں بلا کا زور اور روانی ہے۔ مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا ہے۔ موجودہ دور کے اعلیٰ ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ جامعہ ملیہ دہلی، ساہتیہ اکیڈمی دہلی وغیرہ جیسے اداروں کے رکن خصوصی ہیں۔ مقالاتِ عابد، قومی تہذیب کا مسئلہ، بزم بے تکلف، پردۂ غفلت مشہور تصانیف ہیں۔

حامد حسن قادری حامد حسن قادری بچھراؤں ضلع مرادآباد کے رہنے والے ہیں ۱۹۰۹ء میں ہائی اسکول رامپور سے پاس کیا پھر لاہور سے منشی فاضل وغیرہ امتحانات پاس کیے ۲۷ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں بحیثیت استاد داخل ہوئے اور وہیں سے صدر شعبۂ فارسی اردو کے عہدے سے ریٹائر ہوئے آج کل پاکستان میں مقیم ہیں۔

حامد حسن قادری شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی تاریخ گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ تاریخ و تنقید آپ کے پسندیدہ موضوعات ہوئے۔ آپ کے تنقیدی مقالات ۱۹۱۵ء سے ملک کے بلند پایہ رسائل میں شائع ہو رہے ہیں۔ آپ کے یہاں ادبیت زندگی پر حاوی ہے نثر میں شاعری کرتے ہیں اور ادبی چٹخارے اور ادبی چاشنی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں باغبان، فطرت اطفال، کمال داغ، تاریخ مرثیہ گوئی، تاریخ و تنقید، داستانِ تاریخ اردو، نقد و نظر، ایرانی افسانے، اور صید و صیاد زیادہ مشہور ہیں۔

آل احمد سرور

آل احمد سرور ۱۹۱۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ اے انگلش و اردو میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا پہلے لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر رہے ۱۹۵۵ء میں علیگڈھ یونیورسٹی چلے گئے اور اب وہیں شعبۂ اردو کے چیرمین ہیں آپ کا شمار نئی نسل کے مشہور ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا ہے آپ کی تنقید نگاری کا اپنا ایک مخصوص طرز ہے آپ کے خیالات میں انتہا پسندی اور افراط و تفریط نہیں ہوتی۔ بلکہ ان میں توازن، اعتدال اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ انداز بیان صاف سلجھا ہوا اور خیال آفریں ہوتا ہے۔ طرز نگارش پر حالی اور اقبال کا بہت گہرا اثر ہے سرور شعر و ادب کا تجزیہ کرتے وقت انگریزی ادب اور اردو کی قدیم ادبی روایات سے بھی کام لیتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ترقی پسندی کے خلاف اور قدامت پرستی کے قائل ہیں سرور کے تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں ان میں "تنقیدی اشارے" ادب اور نظریہ" "نئے اور پرانے چراغ" بہت مشہور ہیں۔ اردو تنقید و ادب پر سرور کا گہرا اثر ہے۔ مختلف ادبی حلقوں نے آپ کے طرز نگارش اور تنقیدی نظریات کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

سرور شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ کلام کا مجموعہ "ذوق جنون" شائع ہو چکا ہے سرور صاحب پر بیک وقت کئی ذمہ داریاں ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ہماری زبان اور اردو کے ایڈیٹر، ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے ممبر اور دوسرے بہت سے تعلیمی و ادبی کام۔ جن کی وجہ سے موصوف کو ادبی یکسوئی حاصل نہیں ہے اور اردو ادب کا چمن آپ کے شگفتہ و شاداب گلہائے ادب سے محروم رہتا ہے۔

سید احتشام حسین
۱۹۱۲ء

سید احتشام حسین ماہل ضلع اعظم گڈھ میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے الہ آباد سے ایم۔ اے امتیاز کے ساتھ

پاس کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں لکچرر ہو گئے ، آج کل الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر ہیں۔ احتشام صاحب نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے آپ امریکہ اور انگلستان کا سفر کر چکے ہیں اور اس کے متعلق اپنے تاثرات " ساحل اور سمندر " کے نام سے ظاہر کر چکے ہیں۔ احتشام صاحب غیر معمولی ادبی ذوق رکھتے ہیں اور بہت ذہین ہیں آپ نے مغرب و مشرق کے امتزاج سے اردو میں ایک انفرادی رنگ پیدا کیا ہے آپ کی تحریریں مدلل اور واضح ہوتی ہیں موصوف کی تنقیدوں میں مادی اور معاشی پہلو منطقی استدلال کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ احتشام صاحب صرف نقاد ہی نہیں بلکہ ادیب اور افسانہ نگار، اچھے مقرر متعدد رسائل و جرائد کے مرتب ہندوستانی زبانوں کے عالم بھی ہیں گو مغرب کی کورانہ تقلید کے قائل نہیں لیکن غیر ملکی خیالات سے مستفید ہونے میں کوئی برائی نہیں خیال کرتے۔ آپ کی زبان آسان، رواں اور شگفتہ ہوتی ہے۔ لسانیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ آپ ایک اچھے استاد شریف الطبیعت اور سلجھے ہوئے خیالات کے انسان ہیں۔

احتشام صاحب کی متعدد کتابیں مقبول ہو چکی ہیں۔ جن میں تنقیدی جائزے روایت اور بغاوت، ادب و سماج، تنقید و عملی تنقید ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ساحل اور سمندر، تاریخ ادب اردو (ہندی) تنقیدی نظریات عکس اور آئینے بہت مشہور ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ " ویرانے " کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۔ دکنی ادب پر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اتنا زیادہ کام کیا ہے کہ تاریخ ادب اردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ افسانہ نگاری، تنقید، تاریخ ادب سوانح نگاری، ادبی تحقیق اور لسانیات، مختلف و متعدد

متوفی ۱۹۶۲ء

موضوعات پر زور صاحب نے اپنے جوہر دکھائے ہیں درجنوں کتابوں کے مصنف
ہیں، سیکڑوں مقالات لکھے۔ لسانیات میں ان کا درجہ نہایت بلند ہے۔ ڈاکٹر
زور کا مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ انھوں نے مغربی طرزِ تنقید سے اُردو داں حضرات کو روشناس
کرانے میں بڑی جانفشانی اور محنت سے کام لیا ہے۔ وہ انگریزی ادب سے استفادہ ضرور
کرتے ہیں لیکن اس سے مرعوب اور متاثر نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر زور کے طرزِ بیان میں
سنجیدگی، سادگی اور روانی ہے۔ تنقیدی مقالات، روحِ تنقید، اُردو شہ پارے، اور
سوانحی ادب میں حیات محمد قلی قطب شاہ، معرکہ کی تصانیف ہیں، وہ ایک کامیاب افسانہ
نگار بھی ہیں ان کے افسانے بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے ہیں ان کے تین مجموعے سیر
گولکنڈہ، گولکنڈہ کے ہیرے، اور طلسم تقدیر، شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔
ادارہ ادبیات اردو قائم کر کے ڈاکٹر زور نے اُردو کی اہم خدمت انجام
دی ہے اس ادارہ سے بہت سی نایاب کتابوں کے علاوہ، کلیات سراج، کلیات
قطب شاہ شائع ہو چکی ہیں۔ افسوس ہے کہ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے زور صاحب
کا انتقال سری نگر کشمیر میں ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو ہو گیا۔

مجنوں گورکھپوری احمد صدیق نام اور مجنوں تخلص ہے اُردو تنقید میں مجنوں
ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ مجنوں نے ابتدائی تعلیم گھر
پر حاصل کی اور مغربی تعلیم کے لیے الہ آباد گئے آپکے دل و دماغ دونوں انقلاب پسند
ہیں۔ روسی تنقید و ادب سے زیادہ متاثر ہیں اور ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔
مجنوں کی تنقید، سنجیدہ، متین اور متوازن ہوتی ہے اردو تنقید میں اس کی اہمیت
و افادیت سب نے تسلیم کی ہے۔
مجنوں ایک ممتاز ادیب اور اچھے نقاد کے ساتھ ساتھ عمدہ افسانہ نویس بھی ہیں لیکن زندگی

کے عام واقعات سے بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ افسانے زیادہ تر المیہ ہیں اور جذبات و محسوسات کا بہترین مرقع ہیں زبان آسان، سادہ، صاف اور رواں ہے۔

افسانوں کے دو مجموعے ، خواب و خیال ، اور ، سمن پوش ، مقبول عام ہوئے۔ ابوالخیر ، پردیسی کے خطوط ، ادب اور زندگی ، اقبال ، نقوش و افکار ، شوپنہار ، نکات مجنوں مشہور تصانیف ہیں۔

کلیم الدین احمد ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ انگریزی ، عربی ، فرنچ اور اطالوی زبانوں سے واقف ہیں۔ انگریزی ادب سے خاص شغف ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اب ڈائرکٹر تعلیمات بہار ہیں۔

کلیم الدین احمد اردو تنقید میں مغربی فکر و نظر کے ساتھ داخل ہوئے اور وہ مغربی ادبیات کی روشنی میں اردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں اس مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے موصوف کو اردو کے فن کاروں اور ان کے فن سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

اردو شاعری پر ایک نظر ، اور اردو تنقید پر ایک نظر یہ دونوں کتابیں ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہیں ، سخنہائے گفتنی ، میں بھی انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات کی وضاحت کردی ہے تنقید میں متانت کے ساتھ ساتھ تلخی کی چاشنی بھی موجود ہے۔ اظہار رائے جرأت اور بے باکی کے ساتھ کرتے ہیں۔

عندلیب شادانی وجاہت حسین عندلیب شادانی یکم دسمبر ۱۸۹۶ء کو سنبھل ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں ایم اے کر کے ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں ۱۹۲۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے ۱۹۳۰ء میں ایران گئے ۱۹۳۳ء میں لندن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ۱۹۳۶ء سے

ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔ ڈاکٹر شادانی عرصہ سے نظم و نثر کے ذریعہ اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کے کلام میں شگفتگی، تازگی اور سادگی ہے الفاظ اور خیالات ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ شادانی صاحب کا اسلوب بیان نہایت سیدھا سادا ہے وہ تشبیہات کا سہارا نہیں لیتے بلکہ مواد کی فراوانی اور خیال کی مضبوطی سے متاثر ہوکر اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ عبارت میں روزمرہ کی چاشنی، محاورات اور ضرب الامثال کا حسب موقع استعمال کرتے ہیں۔ ثقیل الفاظ اور بے کیف عبارت سے پرہیز کرتے ہیں۔ تنقید میں لب و لہجہ سخت ہوجاتا ہے، تحقیقات، دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی، ڈی

ڈاکٹر سید اعجاز حسین لٹ، الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں آپ کے ریٹائر ہوجانے پر یونیورسٹی اپنے ایک تجربہ کار اور قابل فخر استاد سے محروم ہوگئی۔

اعجاز صاحب کی عمر 'عروس ادب' کے گیسو سنوارنے میں گزری درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں ہمیشہ مصروف رہے۔ اُردو ادب کو جدید نظریات اور رجحانات سے مالا مال کیا۔ زبان میں شگفتگی اور روانی ہے۔ اظہار مدعا پر قدرت حاصل ہے۔ نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ اپنی بات ادا کرتے ہیں۔

مختصر تاریخ ادب اور نئے ادبی رجحانات، مذہب اور شاعری سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو ادب اور ملک ادب کے شہزادے وغیرہ مشہور تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی بچھراؤں ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے آپ دلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر رہیں۔ مکاتیب نویسی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے قبل آپ یو۔پی کے تعلیمی شعبوں میں کام کر چکے ہیں تصنیف وتالیف سے آپ کو نظری لگاؤ ہے آپ کی شخصیت بڑی دلکش ہے۔موجودہ ادیبوں میں آپ کا مقام بہت بلند ہے خواجہ صاحب کے طرز تحریر میں دلکشی شگفتگی، سنجیدگی ومتانت روانی وسلاست پائی جاتی ہے۔ آپ کی زبان صاف ستھری رواں اور خیالات واضح ہوتے ہیں آپ کا انداز انتہائی محتاط مہذب اور جامع ہوتا ہے۔

آپ کی متعدد تحقیقی وتنقیدی کتابیں، کلاسکی ادب، میر تقی میر، تذکرہ وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔

اختر اورینوی اختر اورینوی پٹنہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں اردو تنقید وادب آپ کا پسندیدہ موضوع ہے۔ آپکے تنقیدی اور ادبی مضامین ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ آپ کی بے لاگ تنقیدیں اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ تنقید کے اصول اور فن پر زیادہ بحث کرتے ہیں۔ آپ ہر موضوع پر کافی تحقیق وتلاش کے بعد مقالہ لکھتے ہیں۔ بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء پر آپ نے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تنقید جدید تحقیق وتنقید، اور قدر ونظر، آپ کی مشہور تصانیف ہیں

عبدالقادر سروری عبدالقادر سروری، کو فن افسانہ، تنقید اور تاریخ ادب سے خاص دلچسپی ہے، جدید اردو شاعری، پر آپ کی بڑی گہری نظر ہے، آپ پندرہ سولہ برس کی عمر سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں دکن کے

کئی شعراء کے کلام پر تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ آپ کی زبان صاف ستھری، آسان اور رواں ہے، مباحث کو بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آپ کی متعدد کتابیں ادبی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

جدید اردو شاعری، اردو مثنوی کا ارتقاء، کلیات شاہ سراج، اردو کی ادبی تاریخ، قصہ بے نظیر اور زبان اور علم زبان مشہور تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی خاموش ادبی و تحقیقی کام کرنے والوں میں سب سے آگے ہیں۔ علم و ادب، ذہانت و شرافت ورثہ میں پائی، لکھنؤ اور علیگڈھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل، انگریزی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں ایم۔ اے کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد کلیات ولی پر ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔ مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا ہے زبان میں شیرینی و سلاست ہے، انداز بیان سنجیدہ و دلکش ہے۔

ادب و صحافت، تحقیق و تنقید، درس و تدریس دن رات کا مشغلہ ہے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی کے صدر، ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ اس سے قبل جامعہ ملیہ کے ترجمان ماہنامہ جامعہ، کے بھی اڈیٹر رہ چکے ہیں۔ متعدد علمی و ادبی و تنقیدی کتابوں کے خالق ہیں۔ مثلاً

دلی کا دبستان شاعری، کلیات ولی، ادب کا مقصد، ادب کیا ہے، ایک نادر روزنامچہ وغیرہ۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

ڈاکٹر مسعود حسین خاں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں شعبۂ اردو میں ریڈر تھے اب حیدرآباد میں لسانیات کے پروفیسر ہیں۔ آپ اردو زبان کی پیدائش عہد بہ عہد ترقی اور تاریخ ادب اردو میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ اردو کے

ادبی و لسانی پہلوؤں پر آپ کی نظر بڑی اچھی ہے۔ ساتھ ہی ادب کے جمالیاتی آب و رنگ کو بھی خوب نبھاتے ہیں یہ خصوصیت بہت کم ادیبوں میں پائی جاتی ہے۔

لسانیات جیسے خشک موضوع کو بھی آپ شگفتہ انداز میں فصاحت کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے خالق ہیں۔

تاریخ زبان اردو، اردو زبان اور ادب، اردو زبان کا خاکہ، آپ کی مشہور و مقبول تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ۱۵ جون ۱۹۱۶ء کو بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک مسلم یونیورسٹی میں تحقیقی و علمی شعبہ کے استاد و نگراں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء تک پنجاب یونیورسٹی میں یہی فرائض انجام دیتے رہے۔ اب کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مشاغل سے آپ کو بیحد شوق ہے۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ تصانیف کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ایک درجن سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں۔

غزل اور متغزلین، اردو لسانیات، جدید اردو ادب کا بانی، انیسویں صدی میں اردو صحافت، جرأت ان کا عہد اور عشقیہ شاعری، نظیر اکبر آبادی، عہد اور شاعری وغیرہ مشہور تصانیف ہیں۔

وقار عظیم وقار عظیم ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میرٹھ میں حاصل کی بی۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی سے پاس کیا اور ایم۔ اے الٰہ آباد یونیورسٹی سے جملہ امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے دوران تعلیم ہی میں آپ نے دو کتابیں 'ہمارے افسانے' اور 'افسانہ نگاری' لکھیں۔ دہلی سے جب

'آجکل' جاری ہوا تو پہلے ایڈیٹر یہی ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور ماہ نو کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے کچھ عرصہ بعد اورینٹل کالج لاہور میں لکچرر ہوگئے اور اب بھی ہیں۔

وقار عظیم کا علمی و ادبی ذوق ہمیشہ علم کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ پڑھنا لکھنا، اوڑھنا بچھونا ہے جس موضوع کو لیتے ہیں اس کا پورا جائزہ لیتے ہیں اور بے لوث ہوکر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔ آپ دبستان قدیم سے متاثر ہیں اور اپنے تنقیدی شعور کو نئے نظریات کا پابند نہیں کرنا چاہتے۔ الفاظ اور زبان کی صحت کا پورا خیال رکھتے ہیں آپ کے طرز تحریر اور بیان میں سادگی پائی جاتی ہے جو بات کہتے ہیں۔ صاف اور واضح طریقے سے کہتے ہیں آغا حشر اور ان کے ڈرامے۔ داستان سے افسانے تک مشہور تصانیف ہیں۔ ناظر احمد انڈوسولیدر 99 1998

ممتاز حسین پارہ ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے

ممتاز حسین الٰہ آباد سے مسلم یونیورسٹی سے بی ٹی اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا اور مختلف مقامات پر ملازمت کی۔ مگر علمی مشغلہ جاری رکھا انھوں نے کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ فلسفہ اور تاریخ میں خاص دلچسپی ہے یوں تو انھوں نے افسانہ بھی لکھے ہیں لیکن فن تنقید کی طرف زیادہ توجہ دی ان کی تنقید بڑی ٹھوس اور پر مغز ہوتی ہے اس میں جذبات سے زیادہ عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے اپنے خیالات کو دلائل اور تاریخی واقعات سے واضح کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد سوچنے سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ان کے یہاں ایک پروقار سنجیدگی ہے جس سے شگفتگی کم ہوگئی ہے کبھی کبھی الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ساخت سے اجنبیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ نقد حیات، نئی قدریں، وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

ان مشاہیر کے علاوہ مرزا محمد عسکری مرحوم مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم صباح الدین عبدالرحمٰن، امتیاز علی خاں عرشی، غلام رسول مہر، پروفیسر عبد الشکور، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید اختر علی تلہری، ڈاکٹر عبدالعلیم، فراق گورکھپوری، مالک رام، شیخ محمد اکرام، وحید قریشی، ڈاکٹر محمد حسن، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں وغیرہ بھی اُردو ادب و تنقید میں اپنا اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ کتاب کی تنگ دامانی کی وجہ سے ان مشاہیر کا ذکر نہیں کیا جا سکا۔

مقالاتِ صحافت

مہدی الافادی مہدی حسن گورکھپور میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے تعلیم سے ۱۸۶۷ء ۱۹۲۱ء فارغ ہونے کے بعد نائب تحصیلدار ہو گئے۔

ادبی ذوق فطری تھا۔ مزاج میں نفاست و نزاکت۔ لطافت و رنگینی بحد کمال ان کے ہر کام میں یہ خصوصیت نمایاں تھی۔ بہتر سے بہتر کتابیں پڑھتے، شاید ہی کوئی عمدہ کتاب ہو گی جو مہدی نے نہ پڑھی ہو۔

مہدی کی یادگار اکتیس بتیس مضامین کا مجموعہ "افاداتِ مہدی" مکاتیب مہدی اور صحیفۂ محبت مختصر سرمایہ کا لفظ لفظاً بیش بہا اور بیش قیمت ہے شوخی، ادائی شگفتگی، طنز، مہدی کی تحریر کی خصوصیات ہیں تنقید اور تبصرے بھی بے لاگ ہوتے ہیں

مہدی زندہ رہتے تو دوسرے آزاد ہوتے ۱۹۲۱ء میں چمنستان اردو کا یہ شگفتہ و رنگین پھول ہمیشہ کے لیے مرجھا گیا۔

مولانا محمد علی

مولانا محمد علی کی ذات گرامی میں بہت سی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں وہ مخلص رہنما، بلند پایہ شاعر، اور بے مثل صحافی تھے، انھوں نے صحافت کا معیار بلند کیا، کامریڈ (انگریزی) اور 'ہمدرد' اردو، دونوں کے مدیر تھے ان کے اداریئے جرأت و صداقت کے لیے مشہور تھے۔ حریت و آزادی کی ترجمانی محمد علی نے بڑی بے خوفی کے ساتھ کی ہمدرد کے مضامین اس زمانے کے برخلاف معیاری، سنجیدہ اور وزنی ہوتے تھے۔ مضامین و مکاتیب محمد علی' اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔

سر عبدالقادر
۱۸۷۴ء — ۱۹۵۰ء

شیخ عبدالقادر ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد صحافت میں داخل ہوئے پہلے انگریزی اخبارات سے تجربہ حاصل کیا ۱۹۰۱ء میں مخزن، کے نام سے ایک بلند پایہ علمی وادبی رسالہ جاری کیا جس میں حالی، شبلی، اقبال، آزاد جیسے مشاہیر ادب مضامین لکھتے تھے۔ 'مخزن' علم و ادب کا مخزن ثابت ہوا۔ اس کے خزانہ میں ایسے ایسے ادبی جواہرات جمع ہوگئے جن کی آب و تاب سے اب بھی اردو ادب چمک رہا ہے۔ مخزن کے ذریعہ دس سال تک اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ شیخ صاحب کی نثر سلیس اور مدلل و موثر ہوتی ہے۔ سیدھے سادے انداز میں اپنا مطلب ادا کرتے ہیں۔ شیخ صاحب کا انتقال فروری ۱۹۵۰ء میں ہوگیا۔

دیا نرائن نگم
۱۸۸۲ء

منشی دیا نرائن نگم ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں بی اے پاس کیا۔ اور اسی سال سے ماہنامہ "زمانہ" کانپور نکالا جو آپ کے انتقال کے بعد بند ہوگیا۔

آپ بلند پایہ ادیب اور صحافی تھے۔ آپ کی زبان سلیس اور آسان ہے پیرایۂ بیان سلجھا ہوا، 'زمانہ' کے ذریعے آپ نے اردو ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے

آپ ہی کی کوششوں سے ہندستانی اکیڈمی الہ آباد قائم ہوئی تھی آپ نے معاشرت سیاست علم و ادب، غرض ہر موضوع پر گرانقدر مقالات لکھے۔ زمانہ کے کئی نمبر شائع ہو کر اردو ادب میں کافی مقبول و مشہور ہوئے۔

سید سلیمان ندوی سید سلیمان ندوی دلینہ (پٹنہ بہار) میں ۱۸۸۴ء میں ۱۸۸۴ء ۱۹۵۳ء پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے تکمیل تعلیم کے بعد 'ندوہ' کی خدمت کے لیے زندگی وقف کر دی آپ مولانا شبلی کے عزیز ترین شاگرد اور جانشین تھے۔ علوم مشرقی اور عربی و فارسی کے زبردست عالم و فاضل تھے۔ اپنے تمام ساتھیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور قابلیت میں سب سے ممتاز تھے۔ علامہ شبلی کی طرح آخر وقت تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ دارالمصنفین اور معارف کو بڑی خوبیوں سے چلایا۔ سیرۃ النبیؐ کا بقیہ حصہ جو علامہ شبلی مرض الموت کی وجہ سے پورا نہ کر سکے تھے۔ آپ نے اسی انداز اور اسی شان سے پورا کیا۔ رحمت عالم۔ ارض القرآن و سیرۃ عائشہ رضؓ نقوش سلیمانی، خطبات مدارس، حیات شبلی، لغات جدیدہ آپ کی مفید اور مقبول تصانیف ہیں۔ علم و ادب کی خاطر آپ نے یورپ اور اسلامی ممالک کے سفر بھی کیے۔ بھوپال، حیدر آباد اور افغانستان نے تعلیمی مشورہ کے لیے آپ کو بلایا۔ علی گڈھ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

آپ کی تحریر بالکل مولانا شبلی کے رنگ کی ہوتی ہے۔ وہی سنجیدگی اور وہی ادبیت وہی بلندی وہی زور۔ آپ کا رجحان تاریخ ادب اور علمی و ادبی تحقیقات کی طرف زیادہ ہے۔ آپ کو زبان پر کافی عبور حاصل ہے۔ آپ کا طرز تحریر بہت صاف، سادہ زوردار اور تکلف سے پاک ہے۔ ادبیت پختگی اور

علمیت آپ کے اسلوب نگارش کی نمایاں خصوصیت ہے۔ آپ کی انشا پردازی دلکش و منفرد ہے۔ افسوس ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں ترک وطن کر کے کراچی چلے گئے اور وہیں ۲۲ نومبر سنہ ۱۹۵۴ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں اپنی بے مثل صحیفہ نگاری کی بدولت "بابائے صحافت" بن گئے۔ پنجاب میں معیاری صحافت کے بانی اور اکثر صحافیوں کے رہنما اور سرپرست تھے۔ آپ کی نثر شگفتہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ اخبار "زمیندار" کے مالک اور ایڈیٹر تھے آپ نے متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں معرکہ مذہب و سائنس، خیابان فارس، ڈرامہ جنگ روس و جاپان مشہور ہیں۔

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی
دسمبر سنہ ۱۸۷۸ء اگست سنہ ۱۹۵۵ء

خواجہ حسن نظامی دہلوی کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے ملتا ہے۔ پیری مریدی خاندانی پیشہ تھا۔ شریعت طریقت اور روحانیت کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے کامیاب اور مقبول ترین مصنف اور جذبات انسانی اور مذاق عامہ کے سب سے بڑے مبصر تھے۔ طرز تحریر میں بلا کی بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ پیرایہ بیان نہایت دلچسپ اور عام فہم ہوتا ہے۔ معمولی سے معمولی بات کو جدت و ندرت سلاست و روانی کے ساتھ بیان کرنے میں کمال حاصل ہے۔ اختراع پسند طبیعت معمولی سے معمولی لفظ سے طرح طرح کے معنی پیدا کر لیتی ہے۔

حسن نظامی اپنے طرز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ آپ کا اسلوب فطرت کی تصویر کھینچنے میں کمال رکھتا ہے۔ اس لیے آپ مصور فطرت کہے جاتے ہیں۔ مذہب تصوف اخلاق تعلیم معاشرت، تاریخ افسانہ، اقتصادیات تجارت غرض کوئی ایسا موضوع

نہیں ہے جس پر اس خواجہ ادب نے قلم نہ اٹھایا ہو، متعدد رسائل آپ کی ادارت میں نکلے۔ کثرت تصانیف اور فن صحافت میں آپ کی مثال اردو میں مشکل سے ملیگی
سیپارۂ دل، آپ بیتی، کرشن بیتی، غدر کے افسانے، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ دہلی کے افسانے وغیرہ مشہور تصانیف ہیں اگست ۱۹۵۵ء میں خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا

پنڈت کشن پرشاد کول ۱۸۸۵ء ۱۹۵۵ء اکتوبر ۱۸۸۵ء میں بمقام کرہل ضلع مین پوری پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پنڈت کاشی پرشاد کول وکیل تھے۔ کول صاحب نے اردو فارسی کا ذوق اپنے نانا پنڈت بشمبر ناتھ کی فیض تربیت میں پایا۔ ۱۹۰۷ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں انجمن خادمان ہند میں شامل ہوئے اور اس وقت سے آخر عمر تک سوسائٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے لکھنؤ میں مقیم رہے ایڈوکیٹ (انگریزی) اور ہندوستانی (اردو) اخبارات کے ایڈیٹر بھی رہے پھر صبح امید رسالہ میں کام کرتے رہے۔ گنگا پرشاد اور مالائبریری کی تعمیر و ترقی میں کول صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ آپ اس کے آنریری سکریٹری تھے اس کے علاوہ مقامی' صوبائی اور کل ہند انجمن ترقی اردو کے عہدیدار بھی رہے۔ آپنے ہمیشہ بری بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ اردو کی رہنمائی کی۔

آپ کا طرز تحریر نہایت صاف ستھرا، سیدھا سادہ اور سلجھا ہوا ہے۔ عبارت آرائی سے پرہیز کرتے ہیں۔ علمی و ادبی مضامین کے علاوہ ناول اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ آپ کی ذات اردو کے لیے رحمت تھی افسوس کہ موت نے اس ناخدائے اردو کو مہلت نہ دی اور ۱۳ر جنوری ۱۹۵۹ء کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

ادبی و قومی تذکرے، بکھری اگر بتیں، مجبور وفا، قربانی دیوتا، و نیا ادب وغیرہ آپ کی یادگار ہیں۔

قاضی عبدالغفار ادب اور صحافت میں قاضی عبدالغفار کا مرتبہ بہت بلند ہے
متوفی ۱۹۵۶ء متعدد اخبارات کی ادارت کے فرائض ادا کیے حیدرآباد دکن
سے اپنا ذاتی اخبار روزنامہ پیام نکالا۔ آخر عمر میں انجمن ترقی اردو کی ناؤ کو ڈوبنے
سے آپ نے ہی بچایا۔ افسوس کہ اردو کی کشتی منجدھار سے پوری طرح نکلنے بھی نہ
پائی تھی کہ قاضی صاحب کا ۷ ار جنوری ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوگیا۔
قاضی صاحب کا ادبی مذاق نہایت پاکیزہ تھا، زبان و بیان پر آپ کو قدرت
کاملہ حاصل تھی۔ بیان میں ایک خاص قسم کی آن پائی جاتی ہے جو بڑی دلکش ہے۔
نقش فرنگ، لیلیٰ کے خطوط، مجنوں کی ڈائری، آثار ابوالکلام، حیات اجمل،
آثار جمال الدین افغانی آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد صدیوں کے بعد مولانا آزاد جیسی جامع الصفات
۱۸۸۸ء ۱۹۵۸ء ہستیاں پیدا ہوتی ہیں اس صدی میں نہ صرف
ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام میں آپ کا مثل و ثانی نہیں پیدا ہوا۔
آپ کا نام محی الدین احمد اور تاریخی نام فیروز بخت تھا، مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ء
میں ولادت ہوئی۔ آپ کے والد مولانا محمد خیرالدین خدا رسیدہ بزرگ اور درویش
کامل تھے۔ مذہبی روایات کے بموجب عربی فارسی کی تعلیم دی گئی۔ آپ کا ذہن
و حافظہ بلا کا تھا۔ جو کچھ پڑھتے یاد ہو جاتا۔ بہت جلد اسلامی ادب میں کمال حاصل کرلیا۔
آپ کو عربی فارسی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا
آپ ایک جید عالم، مفکر، خطیب، ادیب، انشاء پرداز، صحافی اور سیاستداں تھے
۱۹۱۲ء سے سیاست میں داخل ہوئے اور اس وقت سے جو راستہ اختیار کیا آخر عمر تک اس پر
چلتے رہے۔ آپ کی ادبی و صحافی زندگی "الہلال" سے شروع ہوئی۔ الہلال بند

ہو جانے پر البلاغ نکالا وہ بھی حکومت برطانیہ کا منظور نظر ہو کر بند ہو گیا۔ آپ کے مضامین اُردو فصاحت کی جان اور بیش بہا ادبی خزانہ ہیں۔ آپ کے اسلوب نگارش میں مجتہدانہ شان پائی جاتی ہے۔ اس میں جلال وجمال، بلندی و وقار کے ساتھ بلا کی شگفتگی و سلاست، رنگینی و موسیقیت ہے۔ اسی لیے آپ کی نثر، شعر منثور بھی جاتی ہے۔

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت کا مزہ جاتا رہا

آپ مشکل عربی فارسی الفاظ اور اشعار کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان سے طبیعت پر گرانی کم ہو پاتی ہے۔ آپ کی تحریر میں علمی شان و شوکت ہے، رعنائی و زیبائی ہے۔ متانت و سنجیدگی ہے اور ایک خاص قسم کی آن اور بانکپن ہے، خطیبانہ بلند آہنگی سے بیان کی قدرت اور شوکت و عظمت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ جملوں کی طوالت بھی روانی اور تسلسل میں فرق نہیں آنے دیتی تشبیہہ و استعارے عربی و فارسی ہونے کے باوجود اُردو کی ملکیت معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کی ادبی نگارشات، ادب العالیہ میں شمار کی جاتی ہیں، ادب اعلیٰ کے اتنے پاکیزہ اور اعلیٰ نمونے اردو ادب میں کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں۔

آپ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ آپ کی آخری تقریر انجمن ترقی اُردو ہند کے اجلاس دہلی میں ۱۵ ر فروری ۱۹۵۸ء کو اردو کے تحفظ کے لیے ہوئی تھی۔

دو تین بعد آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور ۲۲ ر فروری ۱۹۵۸ء کو یہ آفتاب علم و ادب اور مذہب و سیاست ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

آپ کی نگارشات میں الہلال و البلاغ کے مضامین ہیں جو مختلف ناموں سے متعدد کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں مضامین ابو الکلام آزاد کے علاوہ "غبار خاطر"

"کاروان خیال" آپکے خطوط کے مجموعے ہیں جو آپنے احمد آباد تسلمہ سے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط اردو ادب و انشاء میں شاہکار تسلیم کئے گئے ہیں
ترجمان القرآن کے نام سے آپنے قرآن پاک کا ترجمہ و تفسیر لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی دو جلدیں ہی مکمل ہو سکیں، تیسری جلد نذر سیاست ہو گئی۔ کاش آپ یہ کام پورا کر سکتے۔

۱۸۹۲ء میں مقام دریاباد ضلع بارہ بنکی پیدا ہوئے

مولانا عبدالماجد دریابادی عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے فلسفہ کے ساتھ بی۔اے ہوئے۔ فلسفہ میں اتنا کمال حاصل کیا کہ آپ عبدالماجد فلسفی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۱۶ء میں آپ سر راس مسعود اور ڈاکٹر عبدالحق کی تحریک پر عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کے ناظم ہوئے جہاں ایک سال تک کام کیا۔

آپ اپنے علمی و فلسفیانہ مضامین کی بدولت بہت جلد مشہور و مقبول ہو گئے۔ آپ ایک بلند پایہ ادیب انشاء پرداز، ممتاز نقاد و صحافی، بے مثل طنز نگار و نکتہ سنج ہیں، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بلا کی نشتریت و تاثیر ہوتی ہے۔ معمولی سے معمولی بات کو جدت و ندرت کے ساتھ بیان کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ تصانیف میں زبان عالمانہ ہے لیکن عبارت میں شگفتگی و روانی قائم رہتی ہے۔ سوال و جواب کے انداز میں اپنا مفہوم انتہائی خوش اسلوبی اور فصاحت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔

عربی، فارسی، انگریزی، اردو ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایک ایک لمحہ تصنیف و تالیف اور مطالعہ کے لیے وقف ہے۔ ہفتہ وار "صدق جدید" کے مدیر ہیں۔
آپ کی سچی باتیں اور حالات حاضرہ پر آپکے مختصر تبصرے، ادبی و سیاسی دنیا میں

انتہائی مقبول ہیں، اردو کا ہر پرچہ ان سے استفادہ کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کا ایک ایک لفظ، درِ شہوار سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

تصانیف میں، فلسفہ جذبات، فلسفہ اجتماع، تاریخ اخلاق یورپ، خطوط مشاہیر، مکالمات برکلے۔ تصوّف و اسلام، اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں، انشائے ماجد، مثنوی بحر المحبت، مقالات ماجد، محمد علی ذاتی ڈائری، حکیم الامت، تفسیر ماجدی وغیرہ ہیں

نیاز فتحپوری نیاز محمد خاں نام فتحپور میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم عربی، فارسی گھر پر ہوئی اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ فتحپور، مدرسہ عالیہ رامپور اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی اور ترکی زبانیں ذاتی مطالعہ سے سیکھیں اور ان پر عبور حاصل کر لیا۔ علم و ادب کا شوق دیگر مشاغل پر غالب آیا، مزاج میں ایک خاص قسم کی آن اور بانکپن ہے، جو اس پیرانہ سالی میں بھی قائم ہے اور ہوشمند جوان بنائے ہوئے ہے۔ یہ انفرادیت اور بانکپن آپ کی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے بیباکی، شگفتگی، اور روانی، جدت و ندرت، آپ کے اسلوب کی خصوصیت ہے زبان پر آپ کو قدرت کاملہ حاصل ہے۔ عربی فارسی الفاظ کی آمیزش اور انگریزی، انشاپردازی کی تاثیر سے اردو نثر کی دیوی کو حسین و دلکش بنا دیتے ہیں۔ مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ حافظہ بلا کا ہے، اختراع پسند، طبیعت اور ایجاد پسند دماغ، زبان و بیان میں تنوع اور رنگینی پیدا کرتا رہتا ہے۔ ہر موضوع پر قلم برداشتہ لکھتے ہیں، آپ ایک بلند پایہ ادیب انشاپرداز، نقاد، افسانہ نگار اور صحافی ہیں۔ آپ کے مقالات اور مکتوبات اردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ آپ کا رسالہ نگار بلند پایہ علمی و ادبی رسالہ ہے جو اپنے گرانقدر مضامین کی بدولت اردو دنیا میں مشہور و ممتاز ہے۔ نگار کے سالنامے

نہایت وسیع ہوتے ہیں۔

آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، جنمیں افسانے بھی ہیں، تحقیقی وتنقیدی کتابیں بھی ہیں، مذہبی اور تاریخی بھی، جن میں سے " نگارستان، جمالستان، گہوارۂ تمدن شہاب کی سرگزشت، جذبات بھاشا، ایک شاعر کا انجام، انتقادیات، مکتوبات نیاز وغیرہ مشہور ہیں

حیات اللہ انصاری

قومی آواز لکھنؤ کے ایڈیٹر، انجمن ترقی اردو یو پی کے سکریٹری اور یو، پی کونسل کے ایم۔ ایل سی ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں اردو زبان کے فدائیوں میں حیات اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو تحریک کی قیادت وہ بڑی خوبی کے ساتھ کر رہے ہیں، ان کی رائے سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن ان کے خلوص پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ یو۔ پی سے ۲۰ لاکھ دستخطوں کو فراہم کر کے صدر جمہوریہ کی خدمت میں اردو کا مقدمہ پیش کرنا حیات صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

حیات صاحب کی صحافت معیاری، متوازن اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ آسان زبان میں ادا کرتے ہیں، منطقی طرز استدلال سے بات واضح ہو جاتی ہے موجودہ زمانہ میں حیات صاحب نے اردو صحافت کا بھرم قائم رکھا ہے۔

افسانوی ادب

افسانوی ادب کے بہت سے مشاہیر مثلاً شمس العلما مولانا نذیر احمد سید عابد حسین، مولانا عبدالماجد دریا بادی، نیاز فتحپوری وغیرہ کا ذکر پیشتر کیا جا چکا ہے۔

ناول و افسانہ نگار

ڈاکٹر نذیر احمد سب سے پہلے ناول نگار تسلیم کیے جا چکے ہیں ان کا ذکر معماران اُردو کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار
۱۸۴۷ء ۔ ۱۹۰۲ء

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۷ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ مگر سرشار کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ انگریزی، عربی، فارسی میں دسترس تھی۔ بڑے ذہین۔ طباع شوخ اور حاضر جواب تھے۔ مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے۔ ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد گئے وہاں دوسو روپیہ ماہوار ملنے لگا۔ رسالہ دبدبۂ آصفیہ کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۰۲ء میں وہیں انتقال کیا۔

سرشار زبردست افسانہ نگار تھے۔ ان کی نمایاں خصوصیت ظرافت اور مزاح ہے، ان کا طرزِ تحریر، شوخ، آسان، سلیس، اور بامحاورہ ہے۔ کہیں کہیں عبارت آرائی بھی کی ہے۔ سرشار کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ ان کے افسانے لکھنؤ کی طرزِ معاشرت، تہذیب و تمدن میلوں ٹھیلوں کے آئینہ دار ہیں۔ سرشار قدیم

وجدید افسانے کی درمیانی کڑی ہیں ان کی تصانیف چمنستان اردو ادب کے سدا بہار پھول ہیں، فسانۂ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، پی کہاں وغیرہ ان کی یادگار ہیں فسانۂ آزاد کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

مولوی عبدالحلیم شرر
۱۸۶۰ء ۱۹۲۶ء

مولوی عبدالحلیم شرر، ۱۸۶۰ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے ان کے بزرگ دربار اودھ میں معزز حیثیت رکھتے تھے شرر نو برس کی عمر میں کلکتہ گئے اور وہیں فارسی و عربی درسیات کی ابتدا کی جس کی تکمیل لکھنؤ اور دہلی میں ہوئی اخبار میں مضامین لکھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا، اودھ پنچ میں مضامین لکھا کرتے تھے بعد میں اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو گئے اور پھر خود ایک ہفتہ وار رسالہ محشر نکالا جس سے ان کی انشا پردازی کی شہرت بڑھ گئی اس کے بعد مولانا نے رسالہ دلگداز جاری کیا جس نے بہت ترقی کی ۱۸۹۰ء میں اسکو بند کر کے حیدرآباد گئے اور دو سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے وہاں آپ نے پھر دلگداز جاری کیا جس کی اشاعت غیر مستقل رہی دکن سے ملازمت ترک کرنیکے بعد مولانا نے لکھنؤ آکر پھر اسے جاری کیا ۱۹۱۸ء میں نظام کی طرف سے تاریخ اسلام لکھنے پر مامور کئے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں ناول و صحافت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

مولانا کثیر التصانیف ہیں انھوں نے بہت سے اخبار و رسائل نکالے جن کے مضامین کو اکٹھا کر کے مضامین شرر کی کئی جلدیں شائع کی گئی ہیں۔ انھوں نے تواریخ و سوانح عمریاں بہت سی لکھی ہیں، وہ ناول نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ان کے خاص خاص ناول زوال بغداد، ایام عرب، اور فردوس بریں وغیرہ ہیں مولانا شرر کا انداز تحریر انگریزی طرز نگارش سے کافی متاثر ہے انھوں نے انگریزی خیالات

اور خوبصورت بندشوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کی تحریروں میں فلسفیانہ خیالات گہرے جذبات، مکالمے اور مناظر بدرجہ اتم موجود ہیں وہ اردو کے اچھے انشاء پرداز اور بہترین ناول نگار تسلیم کئے گئے ہیں۔

مرزا محمد ہادی رسوا ۱۸۵۸ء — ۱۹۳۱ء مرزا محمد ہادی رسوا ۱۸۵۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ انٹرنس پاس کرکے رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کیا، کیمسٹری بھی پڑھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی کا آخری امتحان پاس کرکے بی۔اے کرلیا۔ امریکہ کی اورنٹیل یونیورسٹی سے پی۔ایچ ڈی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈی او ایل کی ڈگری لی۔ آپ مختلف علوم و فنون منطق، فلسفہ، ریاضی اور متعدد زبانیں عربی، فارسی، یونانی، عبرانی، انگریزی، ہندی، سنسکرت جانتے تھے شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی اور اردو ادب پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے۔

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، روزمرہ اور محاورہ، سلاست، ندرت، طرز ادا کی برجستگی جذبات و خیالات کی سادگی، فطرت و حیات انسانی کا گہرا مطالعہ، آپ کی خصوصیات ہیں۔

عبارت میں بات چیت کا انداز روانی اور شگفتگی ہے۔ آپ نے فلسفہ میں متعدد کتابیں لکھیں ناول میں شریف زادہ، امراؤ جان ادا نہایت مشہور و مقبول ہیں۔

امراؤ جان ادا پہلا ناول ہے جو ناول کی صحیح تعریف میں آتا ہے آپکے تنقیدی خطوط کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے ان سے آپکی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے آپ کا انتقال ۷۳ سال کی عمر میں ۱۹۳۱ء کو ہو گیا۔

مصور غم مولانا راشد الخیری ۱۸۶۸ء — ۱۹۳۶ء ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کرکے ۱۸۹۱ء میں محکمہ بندوبست میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں ملازمت سے مستعفی ہو کر سارا وقت

تصنیف و تالیف میں گزارنے لگے۔ مولانا کی ادبی زندگی ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ آپنے منازل السائرہ تصنیف کی ۱۹۰۵ء میں آپنے مستورات کے لیے ماہنامہ رسالہ عصمت جاری کیا۔ یہ رسالہ عورتوں کے لیے آب حیات ثابت ہوا مولانا کو تعلیم نسواں سے تمام عمر دلچسپی رہی۔ لڑکیوں کے لیے ایک رسالہ بنات بھی جاری کیا تھا۔ آپنے اپنی تصانیف اور رسالہ کے ذریعہ ہندوستانی خواتین کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ مولانا کا سارا زور قلم عورتوں کے حقوق کی حمایت اور ان کی تعلیم اور ذہنی و معاشرتی اصلاح میں صرف ہوا۔

مولانا کی زبان خاص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے آپ کا روزمرہ انگریزی اثر سے پاک اور ٹھیٹھ ٹکسالی ہے مولانا کا طرز تحریر ڈاکٹر نذیر احمد سے بہت متاثر ہے لیکن وہ خود صاحب طرز مصنف اور انشاءپرداز ہیں اور ایک مخصوص اسلوب بیان کے مالک ہیں۔

ہرچند کہ مولانا کی تحریروں میں شگفتگی اور کہیں کہیں خوش طبعی نظر آتی ہے مگر ان کا عام لہجہ المیہ ہوتا ہے سوز و گداز ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ سوز و گداز اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والا مشکل سے آنسو ضبط کر سکتا ہے اسی لیے دنیائے ادب میں انھیں " مصور غم " کا خطاب ملا ہے۔

مولانا کی تصانیف بکثرت ہیں جو زیادہ تر ناول اور مذہبی واقعات نگاری پر مشتمل ہیں اور ان کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے۔ ناولوں میں صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نوحہ زندگی، منازل السائرہ زیادہ مشہور ہیں مولانا کی چند مقبول تصانیف آمنہ کا لال، گدڑی کا لال، گرداب حیات اور عروس مشرقی وغیرہ ہیں۔

۱۹۳۶ء میں اس ترجمان غم اور حامی نسواں کا انتقال ہو گیا۔

منشی پریم چند
۱۸۸۰ء — ۱۹۳۶ء

اصلی نام دھنپت رائے تھا مگر پریم چند کے لقب سے مشہور ہوئے ۱۸۸۰ء میں بمقام موضع پانڈے پور ضلع بنارس پیدا ہوئے۔ سات آٹھ سال فارسی کی تعلیم حاصل کرکے انگریزی میں انٹرنس پاس کیا اس کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت کرلی، ادبی زندگی کی ابتداء ۱۹۰۱ء سے ہوئی۔ پریم چند کے مضامین شروع شروع میں رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوئے۔

پریم چند کو افسانہ لکھنے کا خداداد ملکہ ہے۔ مزدوروں، کاشتکاروں اور دیہاتی غریب لوگوں کے جذبات اور احساسات قومی و ملکی پستیوں اور خرابیوں کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرکے ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ مبالغے اور تکلف سے پرہیز کرتے ہیں مگر لطیف استعارات دلچسپ تشبیہات اور رمز و کنایات سے عبارت کا لطف بڑھا دیتے ہیں۔ تحریر میں آمد اور تاثیر ہے، جوش اور زور ہے، سادگی اور سچائی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، آسان اور عام فہم الفاظ، سیدھا سادا انداز بیان، سادگی، خلوص، ہمدردی، محبت پریم چند کے افسانوں کی خصوصیت ہے وہ ادب کو صرف دل بہلاؤ کی چیز نہیں سمجھتے بلکہ اسے زندگی کے لیے منارۂ نور سمجھتے ہیں۔ پریم چند کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت ہے، دونوں زبانوں میں متعدد افسانے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

خواب و خیال، بازار حسن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، چوگان ہستی، بیوہ، گئودان، میدان عمل وغیرہ۔

سدرشن

پنڈت بدری ناتھ سدرشن مشہور افسانہ نگار ہیں منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کی بعض خصوصیات سدرشن کے حصہ میں آئی ہیں۔ اظہار جذبات

پرسدرشن کو کمال حاصل ہے زبان صاف سادہ، میٹھی اور رسیلی ہوتی ہے
تشبیہیں زیادہ تر ہندوستانی ہوتی ہیں۔ کردار نگاری اور مرقع نگاری سدرشن
کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے ہندی اُردو دونوں میں افسانہ لکھتے ہیں۔

بیگناہ مجرم، محبت کا انتقام، چندن، بہارستان، تہذیب کے تازیانے
اور زہریلا آب حیات، سدا بہار پھول وغیرہ سدرشن کی تصانیف و تراجم ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم سجاد حیدر سنہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے علی گڑھ میں تعلیم حاصل
سنہ ۱۸۰۱ء سنہ ۱۹۴۰ء کی ملازمت کے سلسلہ میں ملک کے باہر رہے سنہ ۱۹۴۳ء میں
وفات پائی۔

سجاد حیدر اُردو میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے دوسری زبان کے افسانوں کو ترجمہ
کرکے اردو ادب کو گراں بہا بنانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ترکی تخیل
کو اردو میں منتقل کیا اور ترکی افسانوں کا اردو میں اس طرح ترجمہ کیا کہ اس میں اصل کی
شان پیدا کردی۔ اکثر اردو کی ترکیبوں میں اجتہاد سے کام لیا ہے۔ ترجموں میں اتنی زیادہ
برجستگی اور ندرت پائی جاتی ہے کہ وہ بذات خود ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل
کر لیتے ہیں۔ ترکی ترجموں کی کثرت نے سجاد حیدر کے طبع زاد افسانوں میں بھی ترکی
افسانوں کی رومانیت پیدا کردی ہے۔ الفاظ کی نشست اور موزونیت نے ان کی نثر
میں شاعری کا مزا پیدا کر دیا ہے ان کے افسانوں میں حیات انسانی کی نفسیاتی تحلیل
ہوتی ہے۔ موصوف کو حسیات و جذبات انسانی کی نقاب کشائی میں خاص ملکہ حاصل ہے
جس کو ان کی افسانہ نگاری کا ایک خاص جزو سمجھنا چاہیے۔

سجاد حیدر کے افسانوں کا مجموعہ 'خیالستان' کے نام سے شائع ہو کر دنیائے
علم و ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے جبکے کچھ افسانے ترکی ادب کی دین ہیں اور

کچھ انگریزی کی۔ لیکن زیادہ تعداد ان افسانوں کی ہے جو ان کے طبع زاد ہیں۔

سُلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش اردو ادب میں خاص حیثیت کے مالک ہیں جوش کا مقصد اعلیٰ ہندوستانیوں کو مغرب کی اندھی تقلید سے بچانا ہے جس کے لیے موصوف نے مختصر افسانوں، ناولوں طنزیہ اور حکیمانہ مضامین کا سہارا لیا ہے اس لیے افسانوں میں ناصحانہ انداز پیدا ہو گیا ہے جس سے دلچسپی میں کمی ہو گئی ہے۔

جوش کی زبان میں شگفتگی و دلکشی اور بیان میں پختگی و روانی ہے جو ان کے اسلوب بیان میں جدت و ندرت اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ محاورات و تشبیہات بھی نئی نئی استعمال کرتے ہیں۔ تمہید عموماً طولانی ہوتی ہے جو مختصر افسانہ کے لیے نامناسب ہے۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں بمقام علی گڑھ جوش کا انتقال ہو گیا "افسانۂ جوش" اور "فکرِ جوش" جوش کی یادگار ہیں۔

سعادت حسن منٹو

منٹو کے افسانے، جنسی کیفیت اور نفسانی خواہشات کی ترجمانی بڑی بے باکی اور عریانی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر جنسیات کا شدید غلبہ معلوم ہوتا ہے، وہ جنسی بے راہ روی کا سبب غریبی، بھوک، اور افلاس اور اقتصادی پریشانی بتاتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امارت اور دولت میں جنسی بے راہ روی اور بدکرداری زیادہ پائی جاتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ 'دولت' ان کا پردہ ڈھک لیتی ہے اور 'غربت' ایک عیب کو ہزار طرح سے ظاہر کر دیتی ہے۔

منٹو کا اسلوب بیان، سادہ، رواں اور دلکش ہے۔ اس کے لہجے میں بیباکی اور عریانیت ہے۔ طوائفوں اور اسی طبقے کے دوسرے کرداروں کا ذکر وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ جنسیات و نفسیات کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ جذبات کو متحرک

مشتعل کرنے والے الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ ان کے افسانے جنسی آوارگی سے نفرت کے بجائے، لگاؤ، پیدا کر دیتے ہیں۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کو منٹو کا انتقال ہو گیا منٹو کے چند مشہور افسانے یہ ہیں۔

دھواں، بادشاہت کا خاتمہ، لذت سنگ، سیاہ حاشیے، یزید، تلخ ترش شیریں، منٹو کے افسانے۔

اعظم کریوی اعظم کریوی شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی ان کے پہلو میں ایک حساس اور درد مند دل ہے اس لیے وہ زندگی کے نازک واقعات اور لطیف احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں اکثر سیدھے واقعات کو رنگین اور دلکش انداز میں افسانے کے رنگ میں پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے ان کے افسانے حقیقی دنیا کے افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کردار پست طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر کامیاب روشنی ڈالتے ہیں۔ واقعہ نگاری کے سلسلے میں خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں پر ان کا قلم ایک ہی انداز میں چلتا ہے وہ جذبات انسانی کے اچھے ترجمان ہیں۔ اور صداقت اور اصلیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

ان کی زبان کا لوچ، مکالمے کا فطری انداز، جملوں کی شیرینی اور گھلاوٹ، افسانوں میں رنگینی اور جاذبیت پیدا کرتی ہے۔ فارسی اور ہندی کی لطیف آمیزش سے افسانے اور زیادہ دلکش ہو جاتے ہیں

انقلاب، دکھ سکھ، دیہاتی گیت، شیخ و برہمن، ہندوستانی افسانے، ہندی شاعری اعظم کریوی کی یادگار ہیں۔

۱۹۵۸ء میں کسی نے سر تن سے جدا کر کے اس افسانہ نگار کی زندگی کو افسانہ بنا دیا۔

جلیل قدوائی جلیل قدوائی اُردو میں اچھے افسانوں کے لیے غیر ملکی افسانوں کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے روسی افسانہ نگار چیخوف کو اپنا رہنما بنایا اور اس کے افسانوں کے ترجمے کیے اور اتنا اثر قبول کیا کہ ان کے طبع زاد افسانوں میں بھی چیخوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وہی سیرت نگاری اور جذبات نگاری ہر جگہ نمایاں رہتی ہے جو چیخوف کی دین ہے۔ جلیل کا موضوع عام افسانہ نویسوں کی طرح صرف عشق و محبت ہی نہیں ہے بلکہ حیات انسانی اور اس کے معمہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش بھی ہے۔

جلیل کے کردار جانے پہچانے ہیں وہ ان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی اس انداز سے کرتے ہیں جیسے خود ان پر گزر رہی ہے۔ جلیل کے المیہ افسانوں میں نرمی اور گھلاوٹ سوز و گداز اور درد و اثر موجود ہے۔

جلیل کی زبان سلیس اور صاف ہے وہ عبارت آرائی اور مشکل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں ان کا طرز بیان رواں اور شگفتہ ہے۔ سیر گل، سونا دانا، بے غیرت، نقش و نگار، یادگار جلیل ہیں۔

سید علی عبّاس حسینی فروری ۱۸۹۷ء میں بمقام پارہ ضلع غازی پور پیدا ہوئے۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی کرنے کے بعد ایم۔ اے کیا تمام عمر درس و تدریس میں گزاری ۱۹۲۶ء میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے ۱۹۵۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس وقت سے ہمہ وقت "اردو" کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔

معلمی کی سنجیدگی اور خشکی پر افسانہ نگاری کا شوق غالب رہا۔ بچپن ہی سے افسانہ نویسی کا شوق تھا سب سے پہلی کہانی "پژمردہ کلیاں" پندرہ برس کی عمر میں لکھی جو زمانہ کانپور میں شائع ہوئی تھی۔

حسینی صاحب کی زبان میں شیرینی اور سادگی ہے پریم چند کی طرح آپ کے افسانوں کا مرکز اور محور بھی دیہاتی زندگی ہے۔ فطرت انسانی کے آپ نباض ہیں۔ ادب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ سماج کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ بڑے بڑے ادبی نکات رمزیہ انداز، ہلکے پھلکے الفاظ میں بیان کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ طنز و مزاح کی چاشنی عبارت کو بے مزہ نہیں ہونے دیتی۔ تشبیہوں اور استعاروں نیز ہندی کے عام فہم اور سادے الفاظ کے استعمال سے عبارت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے افسانوں کا پلاٹ دلکش اور فطری ہوتا ہے۔ سماج کی اصلاح آپ کے افسانوں کا بنیادی مقصد ہے۔ آپ بہترین افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ آپکے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آئی سی۔ ایس، باسی پھول، کچھ ہنسی نہیں ہے، ہمارا گاؤں، طلسم اسرار۔ سر سید احمد پاشا، زمینوں کا بادشاہ، حکیم پانا، وغیرہ آپ کی مشہور تخلیقات ہیں۔

اختر رائے پوری ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے مغربی

اختر رائے پوری ادب سے استفادہ کر کے اردو ادب میں بیش بہا افسانے دیے۔ اختر کے آرٹ میں موجودہ نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کو محسوس کرانے کے لیے پُر زور اور باثر انداز بیان موجود ہے۔ ان کی نظر میں ہر اس چیز پر پڑتی ہے جس کو سماج کا ناسور سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بیان میں ایک خاص متانت و دلکشی ہے اور انداز بیان میں ضبط و اثر اور اختصار و معنی آفرینی کارفرما ہے وہ عام ادیبوں کی طرح ہماری روح میں تسکین اور خواب کا عنصر آنے نہیں دیتے بلکہ اس کو مضطرب، بے چین اور تڑپتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں ان کا طرز تخیل افسانہ پڑھنے والوں کو خاص طور پر متاثر کرتا ہے وہ بعض جگہ مشکل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

لیکن موقع ومحل کا خیال رہتا ہے اس لیے عبارت میں دلکشی ختم نہیں ہونے پاتی۔
اختر رائے پوری اپنی تنقیدوں سے بھی اردو ادب میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر چکے ہیں ان کے افسانوں کے مجموعے "زندگی کا میلہ"۔ "محبت اور نفرت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

کرشن چندر ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر حقیقت پسندی، لہجہ کی متانت، جذبات واحساسات کی ترجمانی، طنز اور مزاح کی خوشگوار آمیزش، دلکش رمزیہ نگاری و منظر نگاری میں نمایاں مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔
پریم چند کے بعد کرشن چندر کے افسانے ہی مقبول خاص و عام ہوئے، کرشن چندر کی ترقی پسندی، تہذیب و شرافت کی آئینہ دار ہے، وہ انسانیت، کو اصلی روپ میں دیکھنا چاہتی ہے کرشن چندر شہری اور دیہاتی ماحول کی ترجمانی بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ انھوں نے غریب، مزدور اور متوسط طبقہ کی زندگی کے حالات کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اور ان کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ موجودہ سماج کی کالدبار کی زندگی سے وہ متنفر ہیں اور اس کی خرابیوں پر وہ بھرپور وار کرتے ہیں۔
کرشن چندر کی زبان افسانہ نگاری کے لیے نہایت موزوں ہے۔ قدرت نے انھیں افسانہ نویسی ہی کے لیے بنایا ہے، ایک ایک لفظ افسانوی خصوصیت رکھتا ہے۔ انداز بیان صاف، واضح، دلکش اور پُراثر ہے۔ ابتدا میں رومانیت ان پر غالب تھی، بعد میں اشتراکیت نے اس کی جگہ لے لی۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے دردناک، اور وحشتناک حالات نے انھیں انسانیت کا علمبردار بنا دیا۔ موجودہ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر سرفہرست ہیں۔
ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے ہل کے سائے میں، زندگی کے موڑ پر، ٹوٹے ہوئے تارے، ہم وحشی ہیں، نظارے، شکست، جب کھیت جاگے، سڑک واپس جاتی ہے، الٹا درخت،

ان داتا، گدھے کی سرگزشت، کتاب کا کفن وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہن ہیں اور سعادت حسن منٹو کی ہم خیال و ہم مشرب ہیں انھوں نے بھی اپنے افسانوں میں جنسیات کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ ایک انتہا پسند خاتون ہیں انھوں نے نوجوان لڑکیوں کی دبی ہوئی خواہشات کی ترجمانی بڑی بیباکی اور بے ساختگی کے ساتھ کی ہے جو حقیقت نگاری اور لذت پرستی کی بڑی نازک حدوں سے ہو کر گزرتی ہے ان کے بیان میں لذت آمیز جوش ہوتا ہے ان کی زبان شیریں دلکش و بیباک ہے اسلوب بیان واضح اور جنسیات کے رموز سے واقف ہے۔ کردار نگاری، اور مکالمے کے ساتھ ساتھ عریانیت اور بیباکی کا حسین امتزاج، ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

عصمت کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں بھول بھلیاں، چوٹیں، ایک بات، لحاف، جوانی وغیرہ مشہور ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی

راجندر سنگھ بیدی صرف افسانہ نگاری کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ پست ماندہ طبقے کی حالت زار کے وہ ترجمان ہیں، ذہانت، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، بیدی کی فطرت ہے، مشاہدہ تیز، نگاہ دور رس اور قلب حساس ہے۔ وہ نفسیات سے بھی باخبر ہیں، زبان صاف و سادہ ہے، کردار نگاری میں خاص ملکہ ہے انداز بیان معمولی سے معمولی باتوں کو پُر لطف بنا دیتا ہے، زور و اثر، خلوص اور سچائی، بیدی کے افسانوں کی خصوصیت ہے

گرہن، دانہ و دام ان کے مشہور افسانے ہیں۔

دیوندر ناتھ ستیارتھی — ستیارتھی پٹیالہ کے رہنے والے ہیں سیر و سیاحت کا شوق بے حد ہے ۔ اس لیے ہندستانی سماج کے تجربہ کار مبصر ہیں۔ ستیارتھی کے افسانوں میں ندرت، گہرائی اور وسعت ہوتی ہے پلاٹ اور کردار بڑے جاندار ہوتے ہیں۔ افسانے کے موضوع میں بھی ندرت ہوتی ہے۔ ستیارتھی نے اردو ادب کو ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں کے ہزاروں لوک گیتوں سے روشناس کر کے بڑی اہم اور مفید خدمت انجام دی ہے۔

لال دھرتی ، شیشا ، مشہور افسانے ہیں۔

طنز و مزاح نگار

سجاد حسین ۱۸۵۶ء ۱۹۱۵ء — سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے ان کے والد منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر تھے اور پنشن لینے کے بعد حیدرآباد میں سول جج رہے۔ سجاد حسین نے لکھنؤ میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی۔ ایف۔ اے کرنے بھی نہ پائے تھے کہ تلاش معاش میں فیض آباد پہنچے اور فوج میں اردو پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ سال بھر کے اندر یہ نوکری چھوڑ کر اودھ پنچ شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ جاری ہوا اور ایک سال کے اندر ہی سجاد حسین نے کیسے ایسے سحر البیان جادو نگار اہل قلم ڈھونڈھ نکالے جو اردو ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بنکر چمکے۔ سجاد حسین ۱۸۸۷ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور آخر وقت تک کانگریس کے سرگرم کارکن رہے ان پر ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ فالج گرا لیکن جلد ہی صحتیاب ہو گئے لیکن ۱۹۰۴ء میں فالج کا ایسا دورہ پڑا کہ پھر نہ اچھے ہو سکے۔

اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو یہ آفتاب مزاح و ظرافت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

سجاد حسین اردو صحافت میں ظرافت کے باوا آدم ہیں طنز و مزاح و ظرافت کے وہ پتلے تھے۔ ان کی تحریر میں آزاد خیالی، بیباکی اور صاف گوئی ہے۔ روز مرہ محاورہ اور ضرب الامثال و تمثیلات کی چاشنی ہے۔ تشبیہات و استعارات طنز و مزاح، لطائف و ظرائف کا برمحل استعمال ہے۔ واقفیت و معلومات کے ساتھ ساتھ سلاست و روانی بےساختگی و دلکشی پائی جاتی ہے وہ سیاسی و سماجی حالات کی ترجمانی بڑے دلکش انداز میں کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو ناول نویسی کے نقائص دور کرنے کی طرف خاص توجہ دی اور ان میں ظرافت کی چاشنی شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے متعدد ناول لکھے جن میں احمق الذین، میٹھی چھری، پیارہ سی دنیا، طرحدار لونڈی کایا پلٹ، حیات شیخ چلی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں لیکن حاجی بغلول، ان کا شاہکار ہے

عظیم بیگ چغتائی عظیم بیگ چغتائی جودھپور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد علیگڈھ سے بی۔ اے ایل ایل بی پاس کیا اور ترقی کرتے کرتے چیف جسٹس ہو گئے لکھنے پڑھنے کا ہمیشہ شوق رہا۔ چغتائی کی افسانہ نگاری اور مزاحیہ نگاری کا اپنا جواب نہیں تھا۔ ان کے اکثر افسانوں کا مقصد زیادہ تر اصلاح ہے زبان صاف اور رواں ہے لیکن کہیں کہیں مضامین اور پلاٹ کی دھن میں بے محاورہ سی ہوگئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ ہنسنے ہنسانے والا انسان دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اگست ۱۹۴۱ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

چغتائی کے متعدد افسانے شریر بیوی۔ چینی کی انگوٹھی، کولتار وغیرہ مشہور ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ مزاح نگاری میں منفرد و ممتاز
مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔ دہلی کی ٹکسالی زبان، معیاری روزمرہ
اور ہر طبقہ کے محاوروں پر قدرت کاملہ ہے قدیم رسم و رواج، وضع قطع اور
تہذیب و معاشرت کا ذکر بڑے لطف سے کرتے ہیں انداز بیان میں بیحد شگفتگی
اور روانی ہے

مرزا صاحب کا شمار اُردو کے مزاحیہ نگاروں کے صف اول میں ہوتا ہے۔
تحریروں میں ایک لطیف شوخی اور ظرافت ہوتی ہے مگر ان میں اکثر طنز نہیں ہوتا
ظرافت کے ساتھ طنزیہ نگاری کے دلچسپ نمونے ہیں۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ،
اور نذیر احمد کی کہانی وغیرہ اردو ادب کا سرمایہ افتخار ہیں۔ مضامین کا مجموعہ
مضامین فرحت کے نام سے دو حصوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ملا رموزی سیاسی واقعات پر طنزیاتی انداز میں تبصرہ کرنے میں
ملا رموزی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں مذہب اور قوم کا درد ہے۔
وہ سچی اور بے لاگ بات کہتے ہیں اور لطیف اشاروں، مزاحیہ جملوں میں معاشی
معاشرتی اور اخلاقی حالات پر برابر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی مضمون نگاری
میں واقعیت و حقیقت پائی جاتی ہے۔ ملا رموزی گلابی اُردو کے موجد تسلیم کیے جاتے
ہیں اس میں ایک طرح کی ندرت تو ضرور ہے لیکن عجیب و غریب الفاظ کا تسلسل الجھن
پیدا کر کے اثر زائل کر دیتا ہے۔ جب وہ سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں تو خاص روانی
آجاتی ہے اور مزاح سے فطری مناسبت ہونے کی وجہ سے عبارت میں دلچسپی پیدا
ہو جاتی ہے۔

ملا رموزی کا انتقال جنوری ۱۹۵۲ء میں بمقام بھوپال ہو گیا۔

احمد شاہ نام ہے مگر پطرس کے نام سے مشہور ہوئے۔

پطرس بخاری موجودہ دور کے بہترین مزاح نگاروں میں پطرس کا شمار ہوتا ہے۔ خوش طبعی، شوخی، ظرافت، اور ہلکا طنز پطرس کی خصوصیت ہے۔ انگریزی ادب اور انشاء سے بہت متاثر ہیں۔ معمولی واقعات کو اس طرح لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مضامین کا مجموعہ مضامین پطرس کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پطرس نے صرف اسی مختصر سرمایہ سے ادب میں مستقل جگہ پیدا کر لی ہے۔

رشید احمد صدیقی پروفیسر رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، پر بلا شرکت غیرے قابض ہیں۔ علم و ادب، تحقیق و تنقید پر بھی عبور حاصل ہے۔ آپ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جونپور میں حاصل کی ڈگری مسلم یونیورسٹی سے لی اور وہیں ملازمت کی۔ شعبہ اردو کے عرصہ تک صدر رہے اور اسی عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کے مضامین ظرافت طنز اور تنقید کے بہترین نمونے ہیں۔ آپ نے مزاح نگاری کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے۔ جس کو ہندوستانی اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

آپ کے مضامین میں سنجیدگی اور شستہ ظرافت پائی جاتی ہے آپ کی ظرافت میں ادبی شان موجود ہے آپ کی تحریروں میں سیاسی اخلاقی اور معاشرتی مضامین ملتے ہیں جو لطیف طنز سے بھر پور ہوتے ہیں۔ آپ صرف ایک ادیب ہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے بلند پایہ نقاد بھی ہیں آپ کے نکات لطیف اور معنی خیز ہوتے ہیں باتوں باتوں میں گہرا طنز کر جاتے ہیں آپ کی ظرافت میں رمز و کنایہ اور بلیغ اشارے ہوتے ہیں آپ فارسی اور عربی کی تراکیب اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ زبان کی لطافت مجروح نہیں ہوتی۔ طنزیات و مضحکات، مضامین رشید، خنداں، گنجہائے گراں مایہ، شیخ

نیازی، آشفتہ بیانی میری، ہم نفسان رفتہ، آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

شوکت تھانوی شوکت تھانوی فطری طور پر مزاح نگاری کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں پلاٹ کی پیچیدگیاں نہیں ہوتیں ان کے افسانوں میں روزمرہ کی زندگی اور اس کی معمولی باتوں پر طنز و مزاح کے پیرایہ میں منقید ہوتی ہیں۔ ان کا انداز بیان بہت دل کش ہے عام فہم الفاظ میں ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ تبسم آہی جاتا ہے سودیشی ریل، شوکت کا شاہکار ہے۔ یہ اگرچہ افسانویت اور پلاٹ کی خوبیوں سے معرّیٰ ہے لیکن مکالمہ اور انداز تحریر نے شگفتگی پیدا کر دی ہے اس کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

شوکت تھانوی کثیر التصانیف ہیں، دنیائے تبسم، موج تبسم، بحر تبسم، سیلاب تبسم، طوفان تبسم کے علاوہ جی ہاں بٹے ہیں، نمک مرچ، بیگم صاحبہ، خانم خاں وغیرہ مشہور ہیں۔

کنھیا لال کپور موجودہ دور کے طنز نگاروں میں کنھیا لال کپور سر فہرست ہیں ان کی دوربین نگاہ زندگی کے ہر شعبہ پر پڑتی ہے سیاسی، معاشرتی، علمی ادبی خرابیوں کو نہایت حسین اور مزاحیہ انداز میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ان کی تحریر اور تخیل میں فلسفیانہ عمق نہیں۔ کنھیا لال کپور اپنے افسانوں میں خود ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ اسلوب بیان کی شوخی اور بے باکی فضا میں ایک ایسی لہر دوڑا دیتی ہے جو سمجھنے والوں کو بار بار گدگداتی ہے ان کی وسیع النظری ان کے افسانوں کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیتی۔

ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی اور سادگی ہے ظاہر میں ان کے افسانے سنجیدہ مضامین معلوم ہوتے ہیں لیکن باطن میں نشتر و مزاح کا کام کرتے ہیں وہ محض ہنسنے ہنسانے کیلئے

نہیں لکھتے بلکہ ان کا ایک مقصد ہوتا ہے کنھیا لال کی زبان ٹکسالی اردو ہے جس میں ادبیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ جملوں میں جامعیت و روانی ہے وہ ہر بات نہایت صاف اور برجستہ کہہ جاتے ہیں تشبیہات و استعارات کا سہارا نہیں لیتے۔

ان کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سنگ وحشت، چنگ و رباب، نوک نشتر، شیشہ و تیشہ، اور بال و پر مشہور ہیں۔

ڈرامہ نگار

طالب بنارسی منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی نے ڈرامہ کو فنی اور لسانی دونوں حیثیتوں سے نمایاں ترقی دی ہے طالب کی زبان ڈراموں کے لیے نہایت موزوں ہے۔ مکالمہ نگاری پر کمال حاصل ہے ڈراموں میں لیل و نہار۔ دلیر دل شیر، نگاہ غفلت اور نازاں وغیرہ مشہور ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

آغا حشر کاشمیری آغا محمد شاہ۔ آغا غنی شاہ کے بیٹے۔ ۱۸۷۹ء میں بمقام بنارس ۱۸۷۹ء ۱۹۳۴ء پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی حشر کے والد عربی فارسی کی تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ باپ سے چھپ کر الفریڈ کمپنی کے تماشے دیکھتے رہتے تھے۔ طبیعت اس طرف اتنی زیادہ راغب ہوئی کہ خود ڈرامہ لکھنے لگے اور اپنی ذہانت و صلاحیت کی بدولت اردو ڈرامہ کے شیکسپیر مشہور ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور میں انتقال کیا۔

حشر نے متعدد غیر ملکی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ دوسری تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے متعدد ڈرامے لکھے خود اپنی کمپنی شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی کے نام سے قائم کی مگر نقصان ہو جانے کی وجہ سے بند کر دی آغا حشر کو ڈرامہ کے فن پر عبور حاصل تھا۔ حشر کے ڈرامے

تین دوَر میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں ۔ پہلا دور قدیم طرز کا ہے ۔ دوسرا دور، شیکسپیر کے ڈراموں کے ترجموں پر منحصر ہے تیسرا دور 'بولتے فلم' سے متعلق ہے ۔ اس میں قدیم طرز سے ہٹ کر جدید طرز کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل کی طرف بھی توجہ ہے ۔

حشر نے عمر بھر ڈرامہ نگاری کی ۔ اردو ہندی میں متعدد ڈرامے لکھے ۔ 'اسیر حرص' خوبصورت بلا، ترکی حور، شہید ناز، سفید خون وغیرہ اردو میں اور مدھر مرلی، بھاگیرتھ گنگا، سورداس وغیرہ ہندی میں مشہور ہیں ۔

اشتیاق حسین قریشی اشتیاق حسین قریشی جدید طرز کے ڈرامہ نویسوں میں ممتاز ہیں اور اصلاح معاشرت کے پیش نظر ڈرامہ لکھتے ہیں اردو میں مختصر ڈراموں کے بانی ہیں، لیکن مختصر نویسی کی وجہ سے ڈراموں میں دلچسپی نہیں رہتی زبان آسان اور عام فہم ہوتی ہے ۔ قریشی نے ڈرامہ کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دی ہے ۔ گناہ کی دیوار، معلم اسود، ہمزاد، نقش آخر، نیم شب، بند لفافہ نفرت کا بیج، کٹھ پتلیاں وغیرہ مشہور ڈرامے ہیں ۔

سید امتیاز علی تاج سید امتیاز علی تاج کا شمار اردو کے اچھے ادیبوں میں ہوتا ہے اور اردو ڈرامہ نگاروں میں ان کو ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے ۔ تاج کا وطن پنجاب ہے اور آپ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز لاہور رہا ہے جہاں آپ نے متعدد معیاری رسالوں کی ادارت کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے

اردو ڈراموں کی نہ تو عمر زیادہ ہے نہ تعداد ۔ معیاری ڈراموں میں تاج کا ڈرامہ انارکلی، بہت مشہور ہے ۔ یہ ایک بہترین رومانی ڈرامہ ہے ۔ اس ڈرامہ کا پس منظر عہد اکبری کے بعض تاریخی واقعات سے وابستہ ہے تاہم اس کی تاریخی حیثیت غیر مستند ہے ۔ لیکن

ادبی درجہ مسلم ہے حزنیہ نگاری میں تاج کو کمال حاصل ہے۔ انار کلی کے علاوہ جہاں آرا اور شاہجہاں بھی آپ کے مشہور ڈرامے ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امیر ہیں۔ بچوں کی نفسیات کے زبردست ماہر ہیں، انسانی معاشرہ پر آپ کی نظر بڑی گہری ہے۔ "تعلیم و اصلاح" آپ کا مشن ہے۔ آپ کی تصانیف سے اردو ادب مالامال ہو رہا ہے۔ ڈراموں میں آپ کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ حبہ خاتون، انجام، کھیتی، آزمائش، خانہ جنگی، دوسری شام، ہیروئن کی تلاش، آپ کے مقبول ڈرامے ہیں۔

اُردو کے چند اشاعتی ادارے

انیسویں صدی عیسوی سے ہی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے متعدد مذہبی، تعلیمی، ادبی، اور ثقافتی ادارے اور پریس قائم کیے جانے لگے اور اخبارات و رسائل بھی جاری کیے گئے۔ اس سلسلہ میں نولکشور پریس لکھنؤ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس پریس نے جملہ علوم و فنون کی بشمار اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں شائع کیں۔ یہ پریس ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں کتابوں کی طباعت و اشاعت کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے۔ اس کا ایک بک ڈپو بھی ہے یہاں سے ایک اخبار "اودھ اخبار" بھی نکلتا تھا۔ اس کے علاوہ قریب قریب ہر بڑے شہر میں متعدد پریس قائم تھے اور اخبارات و رسائل بھی شائع ہوتے تھے

ہم یہاں صرف انھیں چند اداروں کا ذکر کر رہے ہیں جن کا مقصد تجارت سے زیادہ اردو زبان و ادب کی خدمت رہی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ اردو نثر کی ترقی اور اس کو عام فہم بنانے میں فورٹ ولیم کالج کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے یہ کالج ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ انگریزوں کو اردو میں تعلیم دی جائے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم کیا اور اس شعبہ کے لیے اردو ہندی کے مشہور مصنفوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان سے عربی، فارسی سنسکرت اور برج بھاشا کی دلچسپ اور مفید کتابوں قصوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ میر امن دہلوی، مرزا علی لطف میر شیر علی افسوس، سید حیدر بخش حیدری، مرزا کاظم علی جواں، مظہر علی خاں ولا، للو لال جی نہال چند لاہوری جیسی باکمال ہستیوں کو ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے یکجا کر لیا۔ اور ان سے ایسی ایسی کتابیں لکھوائیں جو اردو ادب میں زندہ جاوید رہیں گی اگرچہ یہ کتابیں زیادہ تر قصے کہانیوں کی ہیں لیکن ان سے اردو نثر کو صفائی، سادگی، سلاست، روانی، ملی سیدھا سادا اسلوب ملا اور اس میں عام فہم ہونے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

دہلی کالج دہلی کالج ۱۸۲۹ء میں فورٹ ولیم کالج کے بعد قائم کیا گیا۔ اس کالج میں جدید علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ یہ جملہ علوم اردو میں پڑھائے جاتے تھے یہ کالج تمام ہندوستان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں۔ (۱) ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی ۲۔ ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی (مجلس ترجمہ) قائم تھی جو اردو میں درسی کتابوں کا ترجمہ کرتی تھی ۳۔ مشرقی و مغربی علوم ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔

اس کالج نے صحیح طریقہ تعلیم کو رواج دینے اور اردو کو علمی زبان بنانے میں عظیم الشان خدمات انجام دیں ڈاکٹر نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ اسی کالج کے پڑھے ہوئے تھے

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ سر سید نے ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علیگڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، اس کا مقصد خاص مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج و اشاعت تھا ہر سال اس کے اجلاس بڑے بڑے شہروں میں ہوا کرتے تھے جن میں اکابر قوم، مشاہیر ادب، مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا حالی،

مولانا شبلی جیسے باکمال بزرگ شریک ہوتے تھے، لیکچر دیتے، نظمیں پڑھتے۔ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں یہ کانفرنس سب سے آگے رہی اس ادارہ کی طرف سے مختلف علوم و فنون پر کتابیں بھی شائع کی شائع کی گئیں۔ آج بھی اس کا دفتر علی گڈھ میں قائم ہے لیکن عملاً مردہ و بے حس، افسوس ہے کہ یہ بیش بہا خزانہ ہماری غفلت اور بے توجہی کا شکار ہو گیا ہے۔ شاید مرد ساز غیب وں آید کارے بکند تا کہ اس کے چشمۂ علم سے سب سیراب ہو سکیں۔

انجمن ترقی اُردو ہند کا قیام حیدرآباد میں ہوا۔ بابائے اُردو

انجمن ترقی اُردو ہند

ڈاکٹر عبدالحق ۱۹۱۳ء میں سکریٹری منتخب ہوئے اور ان کی انتھک کوششوں (۱۹۰۳ء) اور بعد کی لگن سے یہ انجمن کل ہند ادارہ بن گئی ہر شہر اور بڑے قصبے میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ انجمن کا خاص مقصد توسیع و اشاعت اردو ہے اس سلسلہ میں انجمن کی طرف سے بہت سی نایاب و کمیاب کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی نگرانی میں بہت سی کتابیں ادب، فلسفہ، سائنس، اخلاق، اقتصادیات، معاشیات، تاریخ، وغیرہ کی شائع ہوئیں عربی، انگریزی، فارسی، فرانسیسی زبانوں کی بیش بہا کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے

حیدرآباد سے انجمن کا دفتر دہلی منتقل ہو گیا، لیکن ۱۹۴۷ء کے فسادات میں انجمن کے سارے سرمایہ کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مساعی سے کسی نہ کسی طرح نایاب کتابیں اور قلمی نسخے بچ گئے، اس کے بعد انجمن کا دفتر علی گڈھ منتقل ہو گیا اور مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے۔ مولوی عبدالحق کے بعد قاضی عبدالغفار مرحوم سکریٹری منتخب ہوئے، قاضی صاحب کی وفات کے بعد پروفیسر آل احمد سرور سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انجمن کو گورنمنٹ ہند کی طرف سے سالانہ امداد ملتی ہے جس سے کتابوں کی طباعت و اشاعت کی جاتی ہے۔ انجمن کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار، ہماری زبان، اور ایک سہ ماہی رسالہ "اُردو" پروفیسر آل احمد سرور کی ادارت میں نکلتا ہے۔ اردو ادب میں یہ دونوں رسالہ نہایت مفید ہیں۔

دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۱۷ء عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان میں واحد یونیورسٹی تھی جہاں جملہ مضامین کی اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جاتی تھی، اس مقصد میں اس کو نمایاں کامیابی ہوئی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اردو دشمنی کی زد میں یہ یونیورسٹی بھی آگئی اور یہاں سے اردو کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ دارالترجمہ تھا اس شعبہ نے جملہ علوم وفنون کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ ملک کے مشاہیر ادب اس میں کام کرتے تھے سیکڑوں کتابیں، ادب، تاریخ، فلسفہ، قانون، سائنس، ریاضی، انجینرنگ، غرض ہر مضمون پر تصنیف وتالیف وترجمہ کی گئیں جنھوں نے اردو زبان کے سرمایہ کو وسیع اور مفید بنایا اب یہ شعبہ بھی نیست ونابود کر دیا گیا۔

ادارہ ادبیات اردو ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم کی مساعی جمیلہ سے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ ادبی ادارہ علمی، تعلیمی، ثقافتی، تہذیبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، کتب خانے کا قیام اردو تعلیم بالغان کا انتظام دکنی ادب کے قدیم مخطوطوں کی فراہمی، اس ادارہ کا خاص مقصد ہے ۱۹۳۶ء میں ادارہ کی جانب سے "سب رس" ماہنامہ نکالا گیا جس کے نگراں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تھے ادارہ کے حسب ذیل شعبہ جات ہیں زبان، تنقید وتحقیق۔ تالیف وترجمہ۔ تاریخ وتمدن دکن۔ شعر وادب، سائنس ادب نسواں۔ ادب اطفال۔ کتب خانہ۔ امتحانات۔ نشر واشاعت، انسائیکلوپیڈیا ادارہ کی طرف سے اب تک چھوٹی بڑی ۲۰۵ کتابیں علمی وادبی شائع کی

تفریحی شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر زور ادارہ کے معتمد اعزازی ہی نہیں بلکہ روح رواں تھے۔ انھوں نے مخطوطات ادارہ کو پانچ جلدوں میں ترتیب دیا ہے ادارہ کی لائبریری میں پچیس ہزار مطبوعہ اور پانچ ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں ہیں۔ ادارہ کی طرف سے 'اردو پڑھائی گھر' اسکیم جاری کی گئی ہے جو تلگو داں اور اردو نہ جاننے والے حضرات کو مفت اردو کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔

دار المصنفین اعظم گڑھ دار المصنفین اعظم گڑھ مولانا شبلی کی زندہ علمی و ادبی یادگار ہے۔ اس کے قیام کا منصوبہ مولانا نے بنایا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس کو قائم نہ کر سکے ۱۹۱۵ء میں اس ادارہ کی بنیاد پڑی مولانا شبلی کے ادبی وارث سید سلیمان ندوی اس کے روح رواں تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی صباح الدین عبدالرحمن، شاہ معین الدین ندوی وغیرہ جیسی قابل فخر ہستیاں اس سے متعلق ہیں۔ دار المصنفین سے سیکڑوں بلند پایہ علمی و ادبی، تاریخی، مذہبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں دار المصنفین کا ترجمان 'معارف' ہے جس کے ایڈیٹر شاہ معین الدین ندوی ہیں۔ رسالہ کا معیار علمی و تحقیقی و ادبی لحاظ سے بہت بلند ہے

ندوۃ المصنفین دہلی دار المصنفین کی طرح ندوۃ المصنفین علمی و ادبی، مذہبی خدمات انجام دے رہا ہے اس ادارہ سے زیادہ تر مذہبی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس کے اراکین میں ملک کے بڑے بڑے ادیب اور عالم شریک ہیں۔ ادارہ کی جانب سے علمی، مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور تحقیقاتی مطبوعات کافی شائع ہو چکی ہیں اور ہر سال شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک ماہانہ رسالہ 'برہان' سید سعید احمد اکبر آبادی کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ یہ ... اول درجے کا علمی،

جامعہ ملیہ دہلی مولانا محمد علی مسیح الملک حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے بانیوں میں ہیں ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڈھ میں مولانا محمد علی کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی ۔ اس کے بعد یہ ادارہ قومی ادارہ بن گیا، ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے خون جگر سے اس ادارہ کو سینچکر پروان چڑھایا اور اس کو ہندوستان کی بانٹا یونیورسٹی بنا دیا، جامعہ ملیہ میں درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف، نشر و اشاعت اور طباعت کے شعبہ جات بھی قائم ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب نیز دیگر مشاہیر ادب اس کے ذمہ داران و عہدہ داران ہیں۔ اردو زبان کی ترقی و ترویج و اشاعت میں جامعہ ملیہ کے کارنامے زندہ جاوید ہیں۔

سیکڑوں علمی و ادبی و تحقیقاتی کتابیں جامعہ ملیہ کی زیر نگرانی شائع ہو چکی ہیں، جامعہ ملیہ کا ترجمان "جامعہ" ہر ماہ پابندی سے شائع ہوتا ہے یہ رسالہ اردو کے ممتاز رسالوں میں ہے دوسرا رسالہ "کتاب نما" مکتبہ جامعہ سے نکلتا ہے جو اردو کی تازہ مطبوعات نیز اردو کے متعلق جملہ معلومات فراہم کرتا ہے

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد یو۔پی گورنمنٹ نے اردو ہندی کی ترقی کے لیے ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی قائم کی، اس کے قیام کا سہرا منشی دیانرائن نگم اڈیٹر زمانہ کے سر ہے اس اکیڈمی کا مقصد یہ تھا کہ اردو و ہندی زبانوں میں عمدہ اور مفید تصانیف شائع ہوں اور مستحق ادیبوں کو مالی امداد بھی دی جائے۔

سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر تاراچند جیسے ادب نواز اور قابل فخر حضرات اس ادارہ کے پہلے صدر و سکریٹری منتخب ہوئے اور ملک کے دوسرے مشاہیر ادب اس کے ممبر چنے گئے اکیڈمی کی طرف سے متعدد اردو کتابیں شائع ہوئیں لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی اکیڈمی سے بھی اردو کو جلا وطن کر دیا گیا

معلم آج کے، کل کے سبق کو بھول گئے ہم مت آئی تو اردو کے حق کو بھول گئے

بزم اقبال آگرہ کے تحت جامعہ اردو کا قیام ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا

جامعہ اُردو علیگڈھ اس کا مرکز پہلے آگرہ تھا اور سید محمد طاہر فاروقی اس کے بانی اور پہلے رجسٹرار تھے اس کا مقصد اُردو کی ترویج و اشاعت کے لیے، امتحانات کا جاری کرنا تھا اس نے تین امتحانات ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل، جاری کیے۔ ان امتحانات میں پہلے بہت کم اُمیدوار شریک ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کی تعداد زیادہ ہوتی گئی۔

۱۹۴۷ء تک فاروقی صاحب نے اس کو بڑی خوبی کے ساتھ چلایا لیکن ۱۹۴۷ء میں انقلاب کا اثر رہا اس کو بھی نگلنے کے لیے آگے بڑھا تھا کہ ایک مجاہد اردو، دیوانہ وار مقابلہ پر آیا اور اس نے اس ادارہ کو موت کے منہ میں جانے سے بچالیا۔ فاروقی صاحب پاکستان چلے گئے اور سید ظہیر الدین علوی اس کے رجسٹرار منتخب ہوئے، علوی صاحب کی انتھک کوششوں کا یہ ثمرہ ہے کہ جامعہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا امتحانات میں ایک اور امتحان ابتدائی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور ادیب کامل کے بعد ڈکتور ادب کی بھی اجازت دی جانے لگی ہے۔ اردو کشی کے اس ناساز گار ماحول میں بھی جامعہ کے امتحانات قریب قریب ہر بڑے شہر میں ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے باہر افریقہ، ماریشس میں بھی اس کے امتحانات ہوتے ہیں اس وقت تک اس کے امتحانات کے تقریباً ہونے دو سو مرکز قائم ہو چکے ہیں۔ ہر سال ساڑھے چھ ہزار امیدوار امتحانات میں شریک ہوتے ہیں۔ جامعہ کے نصاب کی باقاعدہ تعلیم دینے کے لیے درس گاہیں بھی قائم ہیں تقریباً ستر پچھتر ادارے ایسے ہیں جن کا جامعہ اردو سے الحاق ہے۔ جامعہ کے امتحانات کا معیار بلند ہے اس کے ممتحن و نگراں ملک کے مشہور ماہر تعلیم اور ادیب ہوتے ہیں، اس کے امتحانات کو اب تک مندرجہ ذیل بورڈوں اور یونیورسٹیوں نے منظور کر لیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی۔ راجستھان یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، اجمیر بورڈ۔ یو۔ پی بورڈ، مدھیہ بھارت ہائر سکنڈری بورڈ

دتی۔ ہائر سکنڈری بورڈ، راجستھان سکنڈری بورڈ۔ جامعہ کے امتحانات پاس کر لینے کے بعد صرف انگریزی میں بی۔ اے۔ ایم اے کر سکتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی نے ایل ایل بی کی بھی اجازت دیدی کا ہے۔ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں بھی داخلہ ہو سکتا ہے۔

ابھی تک جامعہ کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی لیکن سید ظہیر الدین علوی کی مسلسل کوششوں سے اب اس کی عمارت بن رہی ہے۔ بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور گراں قدر رقم عطا کی۔ امید ہے کہ یہ عمارت جلد مکمل ہو جائے گی اور درس و تدریس کا انتظام باقاعدہ ہو جائے گا۔

جامعہ سے اردو کا ایک ماہنہ رسالہ "ادیب" نکلتا ہے۔ اس کے مضامین زیادہ تر نصاب سے متعلق ہوتے ہیں۔ رسالہ نے کئی خصوصی نمبر (شبلی نمبر، انشائیہ نمبر، اصناف سخن نمبر، نصاب نمبر وغیرہ) بھی شائع کیے ہیں۔ ادیب کے مدیر ابن فرید، اور نائب مدیر کبیر احمد جائسی ہیں۔

جامعہ اردو کا ایک مکتبہ "سرسید بکڈپو" ہے۔ جو جامعہ کے امیدواروں کے لیے نصابی کتب فراہم کرتا ہے اور شائع کرتا ہے۔

انجمن اسلام بمبئی انجمن اسلام بمبئی کے تحت ایک شعبہ "ریسرچ" کا قائم کیا گیا ہے۔ یہ شعبہ تحقیقی کام کرنے والوں کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچاتا ہے اس شعبہ کے تحت اعلیٰ اور بلند پایہ معیاری کتابوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ مخطوطات کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ادارہ کی طرف سے کئی معیاری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک سہ ماہی رسالہ "نوائے ادب" بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ ہے اس کا مقصد بھی تحقیقی کام کرنیوالوں کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کے مضامین معیاری اور تحقیقی ہوتے ہیں اس میں مقالہ نما کے تحت اردو میں شائع ہونیوالے مفید اور معیاری مضامین کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ یہ حصہ خاص طور پر بہت مفید ہے۔ رسالہ کے اڈیٹر سید نجیب اشرف ندوی تھے۔ در حقیقت بمبئی میں انجمن اسلام اور اردو تعلیم کے مدارس کا قیام، انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

ادارۂ فروغ اُردو، لکھنؤ عمر میں سب سے چھوٹا ادارہ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارہ کا مقصد بھی اُردو کی ترویج و اشاعت ہے۔ اس ادارہ کو ملک کے مشاہیر ادب کا تعاون حاصل ہے۔ ادارہ کی طرف سے ادبی، تنقیدی کتابوں کے علاوہ ناولیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب تک تین چار سو کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تقریباً بیس پچیس کتابوں پر یو۔ پی گورنمنٹ کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے۔ طباعت کے علاوہ ادارہ دوسری ادبی تقریبات بھی کرتا رہتا ہے۔ یوم مولانا آزاد مرحوم، جگر میموریل مشاعرہ وغیرہ ادارہ کے زیر انتظام ہو چکے ہیں۔

ادارہ کی طرف سے ایک رسالہ "فروغ اُردو" ۱۹۵۵ء سے جاری ہے۔ اس رسالہ کا مقصد اُردو کی آواز گھر گھر پہنچانا ہے اس لیے اس کا چندہ بہت کم رکھا گیا ہے۔ رسالہ نے کئی شاندار اور ضخیم نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ حالی نمبر ۲ جلد، جنگ آزادی نمبر ۲ جلد، جگر نمبر ۲ جلد، ادبی معرکے نمبر، افسانہ نمبر وغیرہ۔ رسالہ کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور مدیر راقم الحروف اور حکیم عبد القوی دریابادی ہیں۔

ان اداروں کے علاوہ پریس، اخبارات، رسائل، ریڈیو اور سینما بھی اُردو کی ترویج و اشاعت کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ موجودہ دور میں ان کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی ہے۔